دینی شعور اور سماجی آگہی کا نقیب علمی تحقیقی مجلّہ

سہ ماہی

شعور و آگہی

لاہور

اپریل تا جون 2019ء/ رجب المرجب تا شوال المکرّم 1440ھ جلد نمبر 11 شمارہ نمبر 2 رجسٹرڈ نمبر 370-S

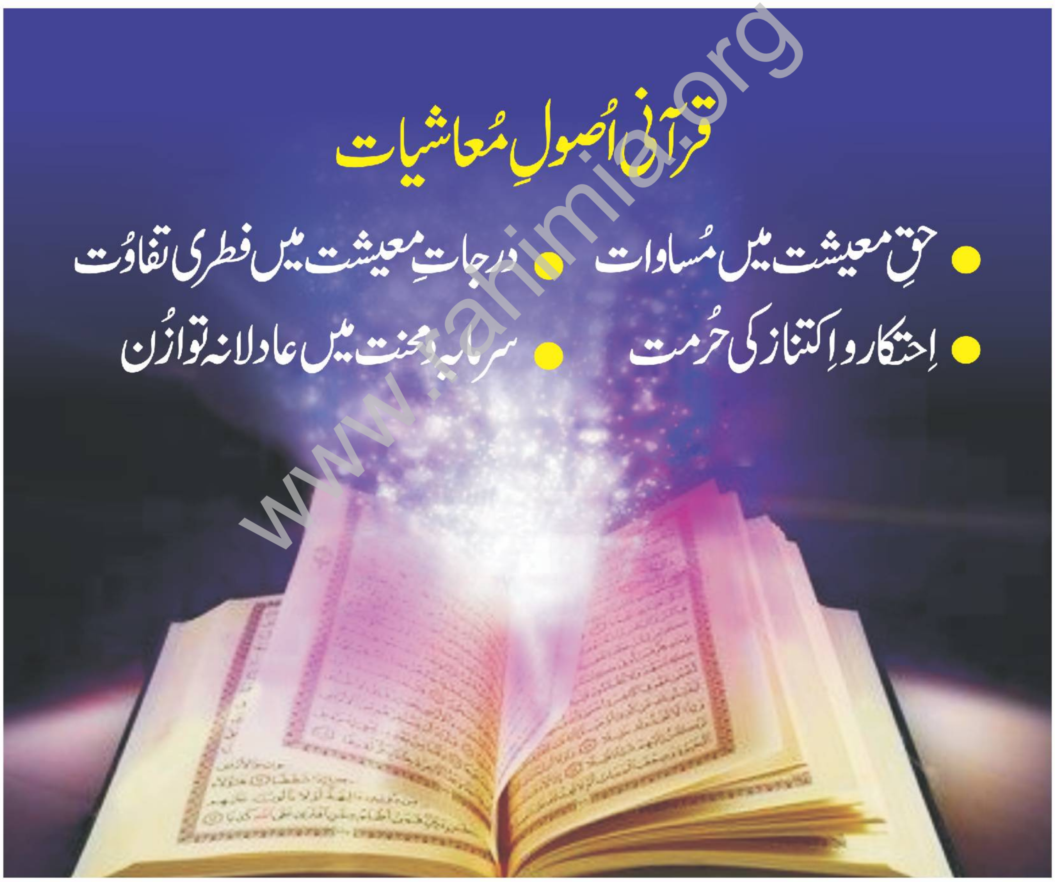

ادارہ رحیمیہ علومِ قرآنیہ (ٹرسٹ) لاہور

www.rahimia.org

دین کے معاشی نظام کو علمی طور پر سمجھنے کی ضرورت واہمیت

’’آج صورتِ حال یہ ہے کہ ہم نے اس گزشتہ عرصے میں اسلام کی ان اعلیٰ تعلیمات کا معاشی نظام نہ تو علمی طور پر لوگوں کے سامنے پیش کیا اور نہ ہی اس کی اساس پر پڑھنے پڑھانے کا کوئی نظام فکر اور تصور ہمارے سامنے رہا ہے۔ آج ہماری یونیورسٹیاں اور کالجز سرمایہ دارانہ اکنامکس پڑھاتی ہیں۔ وہ ایڈم سمتھ اور مارکس وغیرہ کے تصورات پر معاشیات پڑھاتے ہیں۔ زیادہ سے زیادہ زور لگائیں گے تو اسلامی معیشت کے نام پر محض زکوٰۃ، صدقات، خیرات، اوقاف کا ذکر کیا جاتا ہے، ان تصورات کا اسلام کے علمی معاشی نظام سے کوئی تعلق نہیں کہ اُسے اسلامی معیشت کے نام پر پڑھایا جائے کہ اس میں نہ معاشیات کی تعریف، نہ کوئی تقابلی جائزہ، نہ پیدائش دولت، نہ صرفِ دولت کی علمی بحث، نہ عاملین پیدائش دولت پر کوئی گفتگو، نہ اس کے حوالے سے کوئی متفقہ تصورات ہماری یونیورسٹیوں میں پڑھائے جاتے ہیں۔

گزشتہ دوسو سال غلامی کے زمانے میں ہماری سوسائٹی پر سرمایہ داری نظام مسلط رہا ہے۔ آج اعلانِ آزادی کے بعد ستر سال سے بھی وہی نظام قائم ہے۔ اس کے نتیجے میں ملکی اور قومی اثاثہ جات کی نجکاری کا قانون، انفرادیت کی بنیاد پر سرمایہ پرستی اور کھلی منڈی کے نام پر عالمی سامراجی معیشت کا نظام قائم ہے۔ اسی طرح عالمی سطح پر دوسرے ملکوں کی منڈیوں پر قبضے کا سامراجی طور طریقہ جاری ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ ظلم کا نظام ہے، جس سے آج ہماری پوری سوسائٹی عذاب میں مبتلا ہے۔ مسلسل قرضوں کی معیشت کے سبب وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ہر بچہ پیدا ہوتے ہی مقروض ہوتا ہے۔

وَجہ یہ ہے کہ ہم نے دین اسلام اور بالخصوص جس جامعیت کے ساتھ امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے اسلام کا فکر و عمل پیش کیا تھا، اس کو نہ اہلِ علم نے اس طریقے سے پھیلایا اور نہ ہی اس کی اساس پر اپنی معیشت قائم کرنے کے لیے ہم نے کوئی حکمتِ عملی بنائی۔ اللہ سے دعا ہے کہ ہمیں دین اسلام کی ان معاشی تعلیمات کو درست تناظر میں سمجھنے اور اس کے مطابق حکمتِ عملی بنانے اور جدوجہد و کوشش کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین!

(امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ کا نظریۂ معیشت، ص:31)

www.rahimia.org

دینی شعور اور سماجی آگہی کا نقیب علمی، تحقیقی مجلّہ

سہ ماہی شعور و آگہی لاہور

اپریل تا جون 2019ء / رجب المرجب تا شوال المکرّم 1440ھ | جلد نمبر 11 شمارہ نمبر 2 | رجسٹرڈ نمبر 370-S

بانی: حضرت اقدس مولانا شاہ سعید احمد رائے پوری قدس سرہٗ السعید

مجلس ادارت

سرپرست: پروفیسر ڈاکٹر سعید الرحمٰن
مدیرِ اعلیٰ: حضرت مولانا مفتی عبدالخالق آزاد رائے پوری
صدر: مفتی عبدالمتین نعمانی
مدیر: مولانا محمد عباس شاد

مجلس مشاورت

☆ مفتی محمد اشرف عاطف	لاہور	☆ ڈاکٹر سید لیاقت علی شاہ معصومی	سکھر	☆ پروفیسر ڈاکٹر تاج افسر	اسلام آباد
☆ مفتی عبدالقدیر	چشتیاں	☆ پروفیسر ڈاکٹر محمد ناصر	جھنگ	☆ پروفیسر ڈاکٹر محمد سعید اختر	اسلام آباد
☆ مفتی محمد مختار حسن	نوشہرہ	☆ پروفیسر ڈاکٹر محمد افضل	سعودی عرب	☆ پروفیسر قاضی محمد یوسف	حسن ابدال
☆ مولانا عبداللہ عابد سندھی	شکارپور	☆ پروفیسر ڈاکٹر ابرار محی الدین	بہاولپور	☆ پروفیسر ڈاکٹر محمد جہانگیر	لاہور

قیمت فی شمارہ : -/200 روپے | سالانہ زرِتعاون -/800 روپے

شعبۂ مطبوعات

اِدارہ رحیمیہ علومِ قرآنیہ (ٹرسٹ) لاہور

رحیمیہ ہاؤس 33/A کوئینز روڈ (شارع فاطمہ جناح) لاہور

Ph: 0092-42-36307714 , 36369089 - Web: www.rahimia.org

مدیرِ اعلیٰ مفتی عبدالخالق آزاد طابع و ناشر نے اے جے پرنٹرز 28/A نسبت روڈ لاہور سے چھپوا کر دفتر سہ ماہی مجلّہ ''شعور و آگہی'' رحیمیہ ہاؤس 33/A کوئینز روڈ لاہور سے شائع کیا۔

www.rahimia.org

فہرست مقالات

ادار یہ
حرفِ اوّل — ڈاکٹر مفتی سعید الرحمٰن☆ — 3

ولی اللّٰہی معاشی افکار
امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ کا نظریۂ معیشت (3) — از حضرت مفتی عبدالخالق آزادرائے پوری☆ — 5

مطالعۂ معاشیات
معاشیات کی اصطلاحات اور معاشی نظاموں کا جائزہ — تحریر مفتی عبدالخالق آزادرائے پوری — 41

معاشیات
قرآنی اُصولِ معاشیات — تحریر: حضرت مولانا حفظ الرحمٰن سیوہارویؒ، ترتیب وتحقیق: مفتی عبدالخالق آزادرائے پوری — 79

مطالعۂ معاشیات
سرمایہ اور محنت میں عادلانہ توازن — تحریر مفتی عبدالخالق آزادرائے پوری — 101

معاشیات
دین کے معاشی نظام میں محنت کی قدرواہمیت — تحریر مفتی عبدالخالق آزادرائے پوری — 109

تعارف مقالہ نگار

☆ ڈاکٹر مفتی سعید الرحمٰن — سابق چیئرمین شعبہ علوم اسلامیہ، بہاءالدین زکریا یونیورسٹی، ملتان

☆ مفتی عبدالخالق آزادرائے پوری — ناظم اعلیٰ ادارہ رحیمیہ علومِ قرآنیہ (ٹرسٹ) لاہور و مسندنشین سلسلۂ عالیہ رحیمیہ رائے پور

www.rahimia.org

اداریہ

حرفِ اوّل

از ڈاکٹر مفتی سعید الرحمٰن

دینِ اسلام ایک جامع و مکمل رہنمائے حیات کی حیثیت رکھتا ہے۔ جس میں کمال توازن کے ساتھ زندگی کے مختلف شعبوں میں انسانی ترقی کے عملی تقاضوں کو ابدی اصولوں کی روشنی میں زیرِ بحث لایا گیا ہے۔ اس پر دینِ اسلام کی تقریباً ایک ہزار سالہ دور کی تاریخی عملیّت گواہ ہے۔ دورِ زوال میں جہاں مسلم نظامِ حکومت تہہ و بالا ہوا، وہیں دینی فکر پر مختلف اطراف سے یلغار کی گئی۔ جس کا مقصد دینِ اسلام کو انسانی سماج کے ارتقا میں رہنمائی کے عمل سے علاحدہ کرکے اس کو ماضی کی داستان بنانا ٹھہرا۔ چناں چہ اجتماعی تبدیلی سے عاری انفرادی اصلاح، حصولِ اقتدار کے لیے دینی تعلیمات سے کھلواڑ اور روحِ عصر سے بے گانہ مذہبی جذبات کو تشدد آمیز بنانے جیسے کئی حربے اختیار کیے گئے۔ اسی تسلسل میں معاشیات کے موضوع کو دنیا داری قرار دے کر اس کو دینی دائرے سے خارج کرنے کی ایک انتہا نے فروغ پایا تو دوسری انتہا دین کی اقتصادی تعلیمات کو معاشرے کے بالا دست طبقات کے پشتیبان کے طور پر متعارف کروانے کی صورت میں رونما ہوئی۔ ان انتہاؤں کے مابین اعتدال کی فکر ہی دینِ حنیف کی حقیقی پہچان ہے۔

مجلّہ ''شعور و آگہی'' نے دینِ اسلام کے رُخِ روشن سے آگہی اور اس سے متعلق علم و شعور کے فروغ کو اپنا مشن بنایا ہے۔ اسی سلسلے کی ایک کڑی مجلّہ کا زیرِ نظر شمارہ ہے، جس کے تمام مضامین دینِ اسلام کے متوازن معاشی نقطۂ نظر کی ترجمانی کرتے ہیں۔ پہلا مقالہ ''امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ کا نظریۂ معیشت'' اُس چار روزہ لیکچر سیریز کا تیسرا لیکچر ہے، جو حضرت مولانا مفتی عبدالخالق آزاد رائے پوری نے شعبہ علومِ اسلامیہ، بہاء الدین زکریا یونیورسٹی، ملتان کے سیمینار ہال میں پیش کیا۔ اس مقالے میں امام شاہ ولی اللہؒ کے معاشی فکر کی جامعیت کو واضح کرتے ہوئے سرمایہ داری اور اشتراکی نظریات کے ساتھ اس کا موازنہ پیش کیا گیا ہے۔ نیز دولت کی پیدائش، تقسیم، تبادلہ اور استعمال کے حوالے سے دینِ اسلام کی جامع اور انسان دوست فکر کو مؤثر انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ اس مقالے کے آخر میں ان سوالات و جوابات کو بھی قارئین کے استفادے کی نذر کیا گیا ہے، جو لیکچر کے بعد پیش کیے گئے۔ ان جوابات میں فاضل محاضر نے کئی تاریخی حقائق کی بھی نقاب کشائی کی ہے۔

مجلّہ کے دوسرے مقالہ کا عنوان ''معاشیات کی اصطلاحات اور معاشی نظاموں کا جائزہ'' ہے، جس میں فاضل مقالہ نگار حضرت مولانا مفتی عبدالخالق آزاد نے معاشیات کی فی زمانہ غیر معمولی اہمیت کے سبب اُردو داں طبقے بالخصوص مذہبی پسِ منظر رکھنے والے حلقوں کے لیے معاشیات کی ضروری اصطلاحات کی عام فہم اور بامعنی وضاحت کو موضوعِ تحریر بنایا ہے۔ اسی کے ساتھ معاشیات کا دائرۂ کار بیان کرتے ہوئے معاشیات کے اہم ادوار کے ساتھ مغربی معاشرے میں معاشی افکار و نظریات کے ارتقا کے ضمن میں فیوڈلزم، مرکنٹائل اِزم، کیپٹل اِزم اور سوشلزم کے بنیادی اصولوں کا تعارف پیش کیا ہے۔ امید ہے اس مضمون کے

www.rahimia.org

ذریعے قارئین کو معاشی مباحث کو درست تناظر میں سمجھنے اور درست نقطۂ نظر کے تعین میں تسلی بخش رہنمائی حاصل ہوگی۔ ہماری تجویز ہوگی کہ اس مقالے کو علومِ اسلامیہ کے سرکاری و نجی نصابات میں خاص طور پر شامل کیا جائے، تاکہ طلبا کو اس مضمون کا ادراک حاصل ہو۔

پیشِ نظر تیسرا مقالہ برصغیر کے صاحبِ فکر اور جدوجہدِ آزادی کے انتھک رہنما حضرت مولانا محمد حفظ الرحمٰن سیوہارویؒ کی عظیم الشان تالیف ''اسلام کا اقتصادی نظام'' سے ماخوذ ہے۔ یہ کتاب اُردو زبان میں اسلامی اقتصادیات کی اساسی کتاب شمار ہوتی ہے۔ جس نے اس موضوع پر لکھی جانے والی تمام اُردو کتب پر گہرے اثرات مرتب کیے ہیں۔ حتیٰ کہ ناقدین نے بھی اس کتاب کی خوشہ چینی کی ہے۔ تاہم اسلام کی معاشی تعلیمات کے انسان دوست نقطۂ نظر کو اپنے معاشی یا سیاسی مفادات اور مجبوریوں کے سبب دُھندلانے کی کوششیں بھی ہوتی رہی ہیں۔ حضرت مولانا سیوہارویؒ نے قرآن حکیم کی روشنی میں اصولِ معاشیات متعین کر کے عصرِ حاضر میں اسلامی معیشت کے منہج کو مدلل انداز میں پیش کیا ہے۔ زیرِنظر مقالے میں حضرت مولانا مفتی عبدالخالق آزاد رائے پوری نے اس مضمون کو عناوین و حواشی سے آراستہ کر کے قارئین کے لیے زیادہ مفید بنایا ہے۔ جس کے ذریعے سے مضمون سے بہتر آگہی میں مدد ملے گی۔

مجلّہ کے چوتھے مقالہ ''سرمایہ اور محنت میں عادلانہ توازن'' میں قرآن کے چہارگانہ اصولِ معاشیات میں سے چوتھے اصول پر حضرت مولانا مفتی عبدالخالق آزاد رائے پوری نے دادِ تحقیق دی ہے۔ زیرِنظر موضوع میں ''محنت'' کی اساسی حیثیت کو بجا طور پر اُجاگر کیا گیا اور ''سرمایہ'' کے تعاونی کردار کو محنت کے لیے زیادہ مفید اور نتیجہ خیز ہونے کی نشان دہی کر کے ایک متوازن نقطۂ نظر پیش کیا گیا ہے۔ اس مضمون میں زیرِنظر قرآنی اصولِ معیشت کے حوالے سے روایتی کتب و مضامین میں پیدا کردہ ابہام، بلکہ غلط فہمی کا احسن انداز میں ازالہ کیا گیا ہے۔ نیز سرمائے کے استحصالی کردار کے محنت کش اور مزدور دشمن پہلو کو بھی نمایاں کیا گیا، جس سے قارئین کو اسلام کے معاشی نظام کے تناظر میں سرمایہ اور محنت کے باہمی تعلق کی نزاکت کو درست تناظر میں جاننے کا موقع ملے گا۔

مجلّہ کا پانچواں اور آخری مقالہ ''دین کے معاشی نظام میں محنت کی قدر و اہمیت'' اپنے عنوان میں بہت واضح ہے، جس میں حضرت مولانا مفتی عبدالخالق ازاد رائے پوری نے نقلی و عقلی دلائل سے استفادے کے علاوہ تاریخِ اسلام کی معروف علمی شخصیات کی معاشی سرگرمیوں اور ان کے پیشہ وارانہ تعارف سے آگہی دی ہے۔ جس سے یہ حقیقت واشگاف ہوتی ہے کہ دینِ اسلام کی قابل قدر رہنما شخصیات اپنی علمی سرگرمیوں کے باوجود مختلف شعبہ ہائے معیشت میں بھی اپنا نام رکھتے تھے۔ یوں ان کا کردار فرسودہ مذاہب کی سربرآوردہ شخصیات سے جوہری امتیاز رکھتا ہے کہ پادری، پنڈت، پروہت اور علمائے سو کا طبقہ ہمیشہ دوسروں کی محنت پر اپنی معیشت استوار کرتا چلا آتا ہے۔ پھر طُرفہ تماشا یہ ہے کہ اس طفیلی معیشت کو مذہبی معیشت گردانا جاتا ہے، لیکن درحقیقت اسلام کا دامن اس دھبے سے بالکل پاک رہا ہے۔

الغرض! مجلّہ شعور و آگہی کا زیرِنظر شمارہ اپنے مضامین کے حوالے سے ''اسلامی معیشت نمبر'' کی حیثیت رکھتا ہے۔ توقع ہے کہ اسلامی معاشیات سے واقفیت کے لیے متعلقہ دلچسپی رکھنے والے حلقوں میں اس کو بہ نظرِ استحسان دیکھا جائے گا۔

☆

www.rahimia.org

ولی اللّٰھی معاشی افکار؛ عصری اہمیت

امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ کا نظریۂ معیشت

از حضرت مفتی عبدالخالق آزاد رائے پوری

(3)

(پاکستان کی معروف تعلیمی درس گاہ بہاء الدین زکریا یونیورسٹی ملتان میں موسیٰ پاک شہید چیئر شعبہ علومِ اسلامیہ کے زیرِاہتمام ''امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے افکار اورعصرِ حاضر'' کےعنوان سے ایک چار روزہ لیکچر سیریز کا انعقاد کیا گیا تھا۔ اس میں حضرت مولانا مفتی عبدالخالق آزاد رائے پوری دامت برکاتہم نے چار لیکچر دیے۔ ان میں تیسرا لیکچر مؤرخہ 19/ اپریل 2017ء بروز بدھ کو سیمینار ہال، شعبہ علومِ اسلامیہ بہاء الدین زکریا یونیورسٹی ملتان میں ہوا۔ اس سیشن کی صدارت پروفیسر ڈاکٹر محمد اکرم رانا (سابق چیئرمین شعبہ علومِ اسلامیہ، بہاء الدین زکریا یونیورسٹی، ملتان) نے کی، جب کہ نظامت کے فرائض پروفیسر ڈاکٹر محمود سلطان کھوکھر نے سرانجام دیے۔ ان مجالس میں شعبہ علومِ اسلامیہ کے اساتذہ، طلبا اور ملتان شہر سے اہلِ علم و دانش اور علما نے بھی شرکت کی۔ لیکچر کے آغاز میں پروفیسر ڈاکٹر سعیدالرحمٰن نے تمہیدی کلمات ادا کیے۔ لیکچر کے بعد سوال و جواب کی نشست بھی ہوئی۔ اس کے بعد صدرِ مجلس نے صدارتی کلمات ارشاد فرمائے۔ حضرت رائے پوری مدظلہٗ نے جو خطبہ دینے کے لیے امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی کتابوں سے بہت سے اقتباسات جمع کیے تھے، مقالے کی تخریج و تحقیق کرتے ہوئے انھیں متعلقہ مقامات پر مقالے میں شامل کر دیا گیا ہے، تاکہ شاہ صاحبؒ کی اصل عبارتیں بھی قارئین کے سامنے رہیں۔ اس مقالے پر حضرت رائے پوری نے نظرِ ثانی اور تحقیق و تخریج کی ہے اور اسے تحریری صورت دیتے ہوئے عبارتوں کی نوک پلک درست کی اور حک و اضافہ بھی کیا ہے۔ مدیر)

تمہیدی کلمات　از پروفیسر ڈاکٹر سعیدالرحمٰن

بسم اللّٰہ الرّحمٰن الرّحیم. نحمدہٗ و نصلّی علٰی رسولہٖ الکریم.

محترم خواتین و حضرات! آپ دو دن کی گفتگو کے بعد اس پروگرام (امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے افکار اور عصرِ حاضر کے حوالے سے لیکچر سیریز) کی اہمیت سے واقف ہو چکے ہیں۔ چند باتوں کی یاد دہانی اس وقت مقصود ہے۔ سوالات سے یہ بات سامنے آئی کہ حضرت امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے افکار کا مطالعہ کیوں ضروری ہے؟

اس چیز کو پیشِ نظر رکھنے کی ضرورت ہے کہ یقیناً ہماری تاریخ بہت ہی ثروت مند (Rich) تاریخ ہے۔ تاریخِ اسلام کا موضوع یقیناً اپنی جگہ ایک بڑا بھرپور موضوع ہے۔ اس تاریخ میں یقیناً بہت بڑی شخصیات اور بڑے بڑے نام ہیں۔ اور ہر شخصیت کا اپنے دور میں ایک بہت بڑا کردار ہے۔ اُس کے کردار پر، اُس کے کام پر اگلے دور کی عمارت کھڑی ہوئی ہے۔ یہ ایک تاریخ کا تسلسل ہے۔ تاریخی تسلسل کو سمجھے بغیر ہم علوم سے کسی طور پر بھی واقف نہیں ہو سکتے۔ چاہے نیچرل سائنسز ہوں یا سوشل

www.rahimia.org

سائنسز ہوں، ہر علم کا ایک ارتقا ہے۔ وہی ارتقا اگلے دور میں اس کو لے کر جاتا ہے۔ اگر کوئی بھی اس ارتقا کا انکار کر دے اور آغاز سے کسی کام کی تدوین کرے گا تو وہ اپنی چھوٹی سے عمر میں یہی کچھ کر پائے گا، جو پہلے سے ہو چکا ہے اور کوئی اضافہ نہیں کر پائے گا۔ آگے بڑھنے کا ہمیشہ راستہ یہی ہوتا ہے کہ تاریخ میں جو ورثہ ہمارے پاس علمی حوالے سے اور فکری حوالے سے ہے، اس کو سمجھا جائے اور اس کو آگے بڑھانے کے لیے بہ طور بنیاد کے متعین کیا جائے۔

امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی خصوصیت ہے کہ وہ پچھلے ایک ہزار سال سے زائد کے اس ورثے کے اگلے دور میں منتقل کرنے کے محرک بنے۔ انھوں نے سارے ورثے کا نئے سِرے سے جائزہ لیا۔ اُن کا ورثہ پچھلے تمام اہلِ علم، اہلِ بصیرت، اہلِ اخلاص اور اہلِ شعور کی محنتوں کا خلاصہ ہے۔ ہمیں یہ چیز سمجھنی ہے کہ شاہ صاحبؒ کا ذکر تاریخ سے کاٹ کر نہیں ہے، بلکہ تاریخی تسلسل اور تاریخی ارتقا کے ایک اہم مرکز کے طور پر مقصود ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ آج ہماری جس طرح کی سوسائٹی ہے، وہ بُری طرح مذہبی طور پر تقسیم ہے۔ اس پسِ منظر میں شاہ صاحبؒ کا تعارف بہت زیادہ ضروری ہے کہ وہ ایک ایسی شخصیت ہیں کہ جن پر ہمارے آج کے دور کے جو مروّج فرقے ہیں، وہ سب ان پر متفق ہیں، بلکہ وہ اپنا علمی سلسلہ ان تک پہنچاتے ہیں۔ تو کیوں نہ اس شخصیت سے اور اس کے فکر سے براہِ راست آگہی حاصل کی جائے، تا کہ یہ جو بعد کے مسائل ہیں، ان کو ہم صحیح طور پر سمجھ سکیں اور ان گروہیتوں سے نکل سکیں اور فرقوں سے اوپر اٹھ سکیں۔ شاہ صاحبؒ کی شخصیت سوسائٹی کے اور معاشرے کے مختلف گروہوں کے جوڑ کا ذریعہ ہے۔ اس لیے ان کا تذکرہ نہ صرف ہونا چاہیے، بلکہ اُن کی فکر کو پیشِ نظر رکھا جائے تو درپیش مسائل سمجھ بھی آ جاتے ہیں اور ان مسائل کو حل کرنے کی ہمیں نوید بھی ملتی ہے۔ تیسری بات یہ ہے کہ شاہ صاحبؒ جس دور میں آئے تھے، وہ دورِ زوال ہے۔ دورِ زوال کا جو شخص مشاہدہ کرتا ہے، دیکھتا ہے اور تجزیہ کرتا ہے، یقیناً اس کا اسلوبِ بیان دورِ عروج کے لوگوں سے مختلف ہوگا۔ وہ اسلوب آپ کو امام غزالیؒ کے ہاں نہیں ملے گا، امام رازیؒ کے ہاں نہیں ملے گا وغیرہ۔ اس لیے کہ وہ دورِ عروج کے لوگ ہیں اور اپنے اپنے شعبے میں کام کر رہے ہیں اور جس شعبے کی تجدید کی ضرورت محسوس کر رہے ہیں، اس میں ان کا بہت بڑا حصہ ہے۔

شاہ صاحبؒ جس دور میں آئے، وہ زوال کا دور ہے۔ مذہبی طور پر بھی، سماجی طور پر بھی، سیاسی طور پر بھی۔ اور بدقسمتی یہ ہے کہ وہ زوال آج تک پہنچا ہوا ہے۔ اب تک کوئی تبدیلی نہیں آ سکی۔ اس صدی کا جو بھی تجزیہ ہے، وہ آج بھی اسی طرح متعلقہ (relevant) ہے، جیسے اُن کے اپنے دور میں تھا۔ اور پھر شاہ صاحبؒ اس خطے یعنی برصغیر کی شخصیت ہیں اور برصغیر کے مزاج کو سمجھتے ہیں۔ برصغیر کے اندر جو بھی مختلف مذہبی اور مختلف ثقافتی نوعیتیں ہیں، اس سے پوری طرح آگاہ ہیں۔ ان کے مقابلے میں ہم کسی باہر کے مفکر کو اگر پیش بھی کریں گے تو اس کا فکر اپنی جگہ پر کتنا ہی اچھا ہو، وہ ہمارے اس ماحول سے متعلق نہیں ہوگا۔

ہمارے ہاں مغرب کا فکر پڑھایا جاتا ہے۔ روسو پڑھایا جا رہا ہے، ایڈم سمتھ پڑھایا جا رہا ہے، کارل مارکس پڑھایا جا رہا ہے، ٹائن بی پڑھایا جا رہا ہے۔ اس طرح کے بہت سارے لوگوں کے ہمارے سلیبس میں نام موجود ہیں۔ یہ جتنے بھی لوگ ہیں، مغرب کے ماحول میں انھوں نے آنکھیں کھولیں۔ وہاں کے مسائل کو پڑھا۔ وہاں کے مسائل کا تجزیہ کیا۔ قطع نظر اس کے کہ وہ نظریہ کیا ہے۔ یہ ایک علاحدہ موضوعِ بحث ہے۔ اس کے مقابلے پر شاہ صاحبؒ یہیں پیدا ہوئے، یہیں پر رہے، یہاں کی جو بھی سیاسی سماجی کشمکش ہے، اس کا حصہ رہے۔ اس دور میں جو فکری طور پر مسائل تھے، ان کی پوری طرح ان میں آگہی موجود ہے۔ وہ

www.rahimia.org

ایک دیسی (indigenous) مفکر ہیں۔ ہم نے باہر کے مفکر پڑھ لیے۔ وہ فکر یقیناً درآمد شدہ ہے، جب کہ ہمیں یہاں کے مفکر کی بات کو سمجھنے کی ضرورت ہے۔ دیگر مسلم مفکر جو کسی اَور علاقے سے تعلق رکھتے ہیں، ان کا بھی یقیناً بہت بڑا کنٹری بیوشن ہے اور ان سے بھی استفادہ ہوتا ہے۔لیکن بات وہیں آجاتی ہے کہ کسی بھی دوسرے مسلم علاقے کا مفکر، وہ ہمارے مزاج کو اس طرح نہیں جانتا، جس طرح یہاں کا مفکر جانتا ہے۔ اس لیے ہمیں ایک قومی مفکر کی ضرورت ہے، جو یہاں کے قومی مسائل کو سمجھتا ہو، یہاں کی ثقافت کو سمجھتا ہو، یہاں کے مذہبی تنوع کو جانتا ہو۔ جو اس برصغیر کے مسائل پر گہری نظر رکھتا ہو، وہ یہاں کے مسائل کا حل پیش کرتا ہو، دنیا کے کسی بھی کلچر، کسی بھی ثقافت میں اُس کی فکر سے پوری طرح استفادہ ہوسکے۔

دیگر مفکرین ایک جیسی ثقافت میں رہے ہیں، وہاں ایک ہی زبان بولی جاتی ہے۔ ایک ہی مذہب کے لوگ پائے جاتے ہیں۔ اس لیے اُن کی گفتگو، اُن کے تجزیے میں آپ کو وہ تنوع اور ہمہ گیریت نظر نہیں آئے گی، جو ہمیں شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے فکر میں نظر آتی ہے۔ کیوں کہ یہاں کی سوسائٹی ملٹی کلچر ہے۔ یہاں بہت ساری صداقتیں رہی ہیں، بہت سارے مذاہب ہیں، متعدد زبانیں ہیں۔ برصغیر جس کو مولانا عبیداللہ سندھیؒ ''برِعظیم'' کہا کرتے تھے، کہ جو اس کا جغرافیہ ہے، جو اس کا تنوع ہے، وہ ایک براعظم سے کم نہیں ہے۔ گو فنی طور پر ہم اس کو براعظم نہیں کہہ سکتے، لیکن وہ براعظم سے کم نہیں ہے۔ اس کے مقابلے میں آپ دیکھیں آسٹریلیا براعظم ہے، حال آں کہ برصغیر کے مقابلے میں اُس کی کیا حیثیت ہے؟ یعنی برصغیر ایک ایسا علاقہ ہے کہ اس علاقے کا جو بھی مفکر ہوگا، اس کی سوچ کثیر الجہات ہوگی۔ اس لیے یہاں ہم کسی گزرے ہوئے دور کو آواز نہیں دے رہے کہ ایک دور تھا، بڑے اچھے لوگ تھے، شاہ صاحبؒ کی بڑی اچھی شخصیت تھی، ان کو ہم خراجِ عقیدت پیش کر رہے ہیں، یا مذہبی زبان میں اُن کا کوئی عرس پڑھا جا رہا ہے، ایسا قطعاً نہیں!۔

شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے جو گفتگو کی ہے، انھوں نے ایک منہج اور میتھڈ بھی دیا ہے کہ کس طرح چیزوں کو سوچا اور دیکھا جاتا ہے۔ اور وہ میتھڈ ظاہر ہے کہ بعد میں بھی استعمال میں آتا رہے گا۔ اس لیے جو گفتگو یہاں پر ہو رہی ہے، اس میں صرف شاہ صاحبؒ کا ذکر نہیں آتا، بلکہ شاہ عبدالعزیز دہلویؒ، شاہ رفیع الدین دہلویؒ اور ان کے بعد مولانا محمد قاسم نانوتویؒ، مولانا محمود حسن شیخ الہندؒ کا بھی ذکر آتا ہے۔ یہ ایک سکول آف تھاٹ ہے، یعنی ولی اللّٰہی سکول آف تھاٹ۔ اس کو سمجھنے کی ضرورت ہے۔ اس سے ہم کتنا اتفاق کریں یا کتنا اختلاف کریں، یہ ایک علاحدہ موضوع ہے۔ لیکن پہلے اس کو سمجھا تو جائے کہ وہ فکر ہے کیا؟

شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی جو شخصیت ہے، محض عقیدت کی طور پر اُس کا ذکر یہاں پر مقصود نہیں ہے۔ کیوں کہ ان کے عقیدت مند بہت ہیں۔ کوئی کسی کی عقیدت کو چیلنج بھی نہیں کرسکتا۔ بات یہ ہے کہ اُن کی فکر کے اندر کون سے پہلو ہیں، کون سی جہات ہیں کہ جن سے ہم آج کے اس ماحول، اس دور اور اس ملک میں استفادہ کر کے، اس سے روشنی حاصل کرسکتے ہیں اور ہم آج کے مسائل کے لیے کوئی بہتر راہِ عمل تجویز کرسکتے ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ جو بھی اُن کی فکر ہے، وہ دینِ اسلام پر ہی استوار ہے۔

آج عام طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ فلاں آدمی فلاں سے متأثر ہے، یا فلاں آدمی فلاں جگہ سے متأثر ہے، تو شاہ صاحبؒ کے حوالے سے یہ بات بھی نہیں ہے۔ ان کی فکر کیپٹل ازم، سوشلزم اور مغرب کی جمہوریت سے کسی طرح متأثر نہیں۔ کیوں کہ یہ سب چیزیں بعد کی ہیں۔ اس لیے وہ کوئی بات کریں گے تو پھر یقیناً اُن پر یہ پھبتی نہیں کسی جاسکتی کہ وہ فلاں نظام سے متأثر ہیں۔ بلکہ

www.rahimia.org

اُن کا اپنا علم، مطالعہ، تربیت، مشاہدہ، چیزوں پر غور وفکر، عقل کا استعمال، نقل سے استفادہ، کشف کے ذریعے چیزوں کا پرکھنا اور جانچنا۔ یہ سب چیزیں گویا کہ ان کے علم کے ذرائع میں موجود ہیں، اس گفتگو کا مقصد یہی ہے کہ آپ ان چیزوں کو ذہن میں رکھ کر ان موضوعات، جن پر یہاں گفتگو ہوچکی ہے، اور جن پر آج اور کل مولانا مفتی عبدالخالق آزاد صاحب اظہارِ خیال کریں گے، اس پر غور وفکر کریں اور سوالات کے ذریعے اپنے علم میں اضافہ کریں۔ ان شاء اللہ بہت فائدہ ہوگا۔ شکریہ!

خطبہ مسنونہ اور لیکچر

نحمدهٗ و نصلّی علیٰ رسولهٖ الكريم. اما بعد!

فأعوذ باللّٰه من الشّيطان الرّجيم. بسم اللّٰه الرّحمٰن الرّحيم. قال اللّٰه تبارک و تعالیٰ:

وَلَقَدْ مَكَّنّٰكُمْ فِي الْاَرْضِ وَجَعَلْنَا لَكُمْ فِيْهَا مَعَايِشَ ۭ قَلِيْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ ۝۱۰ (1)

و قال النبیّ ﷺ: ''اُطلبوا الرّزق من خبايا الأرض.'' (2) و قال النبیّ ﷺ: ''الاقتصاد فی النّفقة نصف المعيشة.'' (3) صدق اللّٰه العظيم و صدق رسولهٗ النّبیّ الكريم.

معاشیات کی اہمیت

صاحبِ صدر اور معزز اساتذہ، طلبا و طالبات، خواتین و حضرات!

حضرت الامام شاہ ولی دہلویؒ کے علوم و افکار کے حوالے سے آج ہمارا موضوع معیشت جیسے اہم مسئلے پر گفتگو کرنا ہے۔ معاشیات اور اقتصادیات اس دور کا بڑا سلگتا ہوا موضوع ہے۔ بالخصوص اس حوالے سے بھی کہ دنیا بھر پر یورپ کے قبضے کے بعد معاشیات و اقتصادیات کے تصورات زندگی کے باقی تمام زاویوں پر غالب ہوچکے ہیں۔ علم وفکر بھی معاشی اور اقتصادی سرگرمیوں کے تابع ہے، سیاست بھی سرمائے کے گرد گھومتی ہے، مذہب بھی اس کی جیب کی گھڑی بن چکا ہے۔ غور وفکر اور سوچنے کے سوتے بھی سرمائے کے تابع ہوچکے ہیں۔ الغرض! معاشی سرگرمیوں کو بنیادی اہمیت حاصل ہے، بلکہ کسی علم وفکر، ملک، فرد، قبیلے، قوم اور اقوامِ عالم کا جائزہ بھی معاشی حوالے سے ہی لیا جاتا ہے۔

اس دور میں جب کہ معاشی اور اقتصادی معاملات ہر چیز پر چھا چکے ہیں، ایسے میں دین اسلام کی تعلیمات کی روشنی میں علمی اور فنی طور پر اقتصادی امور یا معاشی علوم پر غور وفکر کرنا انتہائی اہمیت رکھتا ہے۔ یہ اس لیے بھی ضروری ہے کہ دنیا میں معاشی حوالے سے جن دو نظاموں نے اس وقت دنیا کے ایک سو نوّے سے زائد ملکوں پر بالادستی حاصل کی ہوئی ہے، وہ کیپٹل اِزم کی شکل میں ہو یا کمیونزم کی صورت میں، دونوں ہی انکارِ مذہب کی اساس پر اپنا سیاسی اور معاشی نظام تشکیل دینے کے دعوے دار ہیں۔ اُن کے خیال کے مطابق سوسائٹی تبھی ترقی کرتی ہے، جب مذہب کا انکار کیا جائے اور خالصتاً معاشی نقطہ نظر سے یا سیاسی نقطہ نظر سے معاشروں کو دیکھا اور پرکھا جائے۔ نیز معاشروں کے مسائل کے حل کرنے کے لیے مادی نقطہ نظر یا دولت اور سرمائے کے تناظر میں تمام امور سرانجام دیے جائیں۔

اہلِ دین کی ذمہ داری

ایسے ماحول میں اہلِ مذہب کے سامنے دو راستے ہیں کہ یا تو وہ مذہب چھوڑنے کا اعلان کریں یا مذہب کی اساس پر سوسائٹی کے سیاسی اور معاشی مسائل کا حل پیش کریں۔ دیگر مذاہب؛ یہودیت، عیسائیت، ہندومت، بدھ مت اور آتش پرست وغیرہ

www.rahimia.org

مذاہب کے ہاں اگر کسی زمانے میں کوئی سیاسی ومعاشی تصورات تھے بھی تو وہ آج پسپا ہوگئے۔ انھوں نے قبول کرلیا کہ گرجا ہمارا، سیاست آپ کی۔ مندر ہمارا، معیشت آپ کی۔ آتش کدہ ہمارا، باقی سب آپ کا۔ انھوں نے اس تقسیم کو قبول کرلیا۔ وہ عقیدے کے اعتبار سے یہودی ہیں، عیسائی ہیں، ہندو ہیں، بدھ ہیں یا کچھ اَور ہیں، وہ چند مذہبی رسومات یا عبادات سرانجام دے کر فارغ ہوجاتے ہیں۔ ایک ہفتے بعد، مہینے بعد یا جیسے بھی اُن کے ہاں ''پرارتھنا'' یا ''مذہبی سروس'' کا کوئی تصور موجود ہے، لیکن سیاسی اور معاشی معاملات میں وہ ان دونوں نظاموں میں سے کسی ایک نظام، بلکہ زیادہ تر کیپٹل اِزم یا سرمایہ داری نظام کے تابع ہیں۔ اس تناظر میں مسلمانوں کو یہ فیصلہ کرنا ہے کہ کیا وہ مذہب کے حوالے سے اپنی یہ حیثیت قبول کرنے کے لیے تیار ہیں؟ اور کیا جس دین سے وہ وابستگی کا اعلان کرتے ہیں، وہ انھیں اس بات کی اجازت دیتا ہے کہ عبادت تو خدا کی ہو اور سیاست اور معیشت سرمائے کی ہو اور دین سے ہٹ کر ہو۔ یقیناً ایسا نہیں ہوسکتا۔

پھر یہودیت کی حکمرانی کا دور سوڈیڑھ سو یا دوسو سال ہے۔ عیسائیت کا بھی ایسے ہی کچھ سو سال ہے۔ بدھوں کا یا ہندوؤں کے ویدک دھرم کا بھی صرف ایک خطے میں بہت تھوڑا سا عرصہ رہا ہے۔ جب کہ مسلمانوں نے پوری دنیا پر کوئی گیارہ بارہ سو سال تک حکومت کی ہے۔ پورے افریقا، یورپ کے ایک بڑے حصے اور پورے ایشیا پر دینِ اسلام کے ماننے والوں نے نظام قائم کیے۔ دنیا بھر کے لوگوں کے اقتصادی و معاشی مسائل حل کیے اور سیاسی نظام بنائے۔ کم از کم مسلمانوں کی حکمرانی کے چار اَدوار؛ خلافتِ راشدہ، خلافتِ بنواُمیہ، خلافتِ بنوعباس اور خلافتِ بنوعثمان، کے دوران حکومتوں کے ماتحت عملی سیاسی، معاشی نظام تشکیل دیے گئے ہیں۔ گویا ان تمام گیارہ بارہ سو سالہ دور میں معاشی نظام بھی وجود میں آئے اور سیاسی معاملات بھی طے کیے گئے ہیں۔

مسلم برصغیر کا معاشی نظام

2001ء میں اقوامِ متحدہ نے ایک معاشی سٹڈی کرائی کہ 1000ء سے لے کر 2001ء تک کے ہزار سالہ دورانیے میں دنیا بھر کے تمام ممالک میں معیشت کے گراف کی نوعیت کیا تھی؟ اس ہزار سالہ دور میں جغرافیائی تقسیم کے اعتبار سے سات خطوں میں پوری دنیا کو تقسیم کیا گیا۔ دنیا بھر میں جو معاشی اعداد و شمار اقوامِ متحدہ کے آرکائیو (Archive) میں موجود ہیں یا دنیا بھر کے مخطوطات کی شکل میں اقوامِ متحدہ کے علم میں ہیں، ان کی روشنی میں یہ تحقیقی کام کیا گیا۔ انگس میڈیسن (Angus Maddison) کی سربراہی میں کمیٹی بنی اور اس نے ایک سٹڈی کی، اقوامِ متحدہ کی ویب سائٹ پر وہ کتاب موجود ہے: ''ہزار سالہ معیشت کا جائزہ'' (The World Economy .A Millennial Perspective) اس میں اس بات کا اعتراف کیا گیا کہ سولھویں اور سترھویں صدی عیسوی میں ہندوستان کی معیشت دنیا کی نمبروَن (No.1) معیشت تھی۔ پیدائش دولت، تقسیم دولت، تبادلہ دولت اور صَرفِ دولت کے اصول پر معاشیات کے جو بنیادی پیرامیٹرز (parameters) ہیں، اس کی روشنی میں آج سے پہلے کا دوسو سالہ دور وہ ہے، جس میں — ہندوستان دنیا کی نمبروَن معیشت ہونے کی وَجہ سے — یورپ میں ''سونے کی چڑیا'' (Golden Sparrow) کے عنوان سے مشہور تھا۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ معاشی ترقی کا یہ عمل بغیر کسی معاشی سسٹم کے نہیں ہوسکتا، کیوں کہ کسی معاشی نظام کے تحت ہی معاشی نشو ونما ہوتی ہے۔ مسلمانوں کی آمد سے پہلے ہندوستان کی معاشی حالت کیا تھی؟ وہ بھی سب کے سامنے ہے اور یہاں مسلمانوں

www.rahimia.org

کے آنے اور ان کے نظامِ حکومت اور معیشت کے قائم ہونے کے نتیجے میں وہ دنیا کی نمبر وَن معیشت بنا۔ اور وہ دنیا کی کل دولت کے پچیس فی صد کا مالک تھا۔

جس دینِ اسلام نے معاشی تعلیمات بیان کی ہیں، اس کے اصول اور ضابطے بتلائے ہیں، قرآن حکیم کی تعلیمات معاشی حوالے سے واضح اور دوٹوک ہوں، نبی اکرم ﷺ کی تعلیمات ہوں، احادیثِ مبارکہ کا ذخیرہ ہو، فقہا کی فقہی جزئیات، خرید و فروخت، لین دین، معاشی امور کی قانونی فقہی صورتوں سے فقہا کی کتابیں اور فتاویٰ جات بھرے ہوئے ہوں اور اس کا عملی نظام بھی موجود رہا ہو۔ کیا اس کے ماننے والے اس بات پر قناعت کرنے پر تیار ہیں کہ وہ مسجد میں صرف نماز اللہ کی پڑھیں گے یا انفرادی طور پر روزہ، حج اور زکوٰۃ دیں گے، یعنی عبادت کرنے میں وہ آزاد ہوں، لیکن سیاسی اور معاشی معاملات میں وہ اس دور کے مادی نظام ہائے حیات کو قبول کرنے کے لیے تیار رہیں اور خرید و فروخت اور لین دین و دیگر قوانین نبی اکرمؐ کی تعلیمات سے ہٹ کر ہوں؟ یقیناً یہ بات درست نہیں ہوسکتی ہے۔

اسلام کا اپنا ایک مستقل معاشی نظام

اسلام اپنا ایک مستقل معاشی نظام رکھتا ہے، اس کا ایک فلسفہ معیشت ہے، وہ معاشی قوانین اور ضابطے بیان کرتا ہے اور اسی کی اساس پر وہ ایک عملی نظام بناتا ہے۔ یہ گفتگو کرتے ہوئے آج اس حقیقت کو بھی پیشِ نظر رکھنا ضروری ہے کہ اسلام کے معاشی نظام کے بالمقابل جو نظام ہائے حیات ہیں، ان کا موازنہ (comparison) بھی پیش کیا جائے۔ کیوں کہ یک طرفہ بات سے تو معاملہ واضح اور دوٹوک طور پر سامنے نہیں آتا۔ یعنی دین کے فلسفۂ معیشت، سرمایہ داری اور سوشلزم کے فلسفۂ معیشت کا باہم موازنہ کیا ہے؟ ایسے ہی انھوں نے علمِ معیشت کے جو بنیادی اساسی امور متعین کیے ہیں، تعریفات، موضوع اور غرض و غایت اور اس کے بنیادی قواعد و ضوابط بیان کیے ہیں، وہ کیا ہیں؟ اور دینِ اسلام اس حوالے سے کیا تعلیم دیتا ہے؟

امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی دینی معاشی فکر میں تجدیدی حیثیت

امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ وہ عظیم مفکر ہیں، جنھوں نے اس تناظر میں دین اسلام کا ایک مکمل معاشی سسٹم واضح کیا ہے۔ اس زمانے میں، جب کہ ابھی نہ موجودہ سرمایہ داری کی پیدائش ہوئی تھی اور نہ سوشلزم کی۔ شاہ صاحبؒ نے 1734ء میں **''حُجّةُ اللّٰه البالِغه''** لکھی ہے۔ شاہ صاحبؒ حرمین شریفین سے رجب ۱۱۴۵ھ/ جنوری 1733ء میں ہندوستان واپس تشریف لائے۔ اس کے ایک ڈیڑھ سال کے عرصے میں شاہ صاحبؒ نے یہ کتاب تصنیف کی ہے۔ اس لیے کہ جمادیٰ الآخریٰ ۱۱۴۸ھ/ 1735ء میں شاہ صاحبؒ نے اپنی کتاب **''همعات''** لکھی ہے۔ اس کتاب میں انھوں نے اَخلاقِ اربعہ بیان کرتے ہوئے تحریر فرمایا ہے کہ:

''ہر کہ ایں را بہ تفصیل خواہد باید کہ بہ کتابِ ما **''حُجّةُ اللّٰه البالِغه''** رجوع کند۔'' (4)

(جس کو ان اَخلاق کی تفصیل چاہیے، وہ ہماری کتاب **''حُجّةُ اللّٰه البالِغه''** کی طرف رجوع کرے۔)

اس لیے اندازہ یہی ہے کہ شاہ صاحبؒ نے 1734ء میں **''حُجّةُ اللّٰه البالِغه''** تحریر فرمائی ہے۔ اور 1735ء میں یہ کتاب ہندوستان بھر میں پھیل گئی۔

ایڈم سمتھ (م 1790ء) نے ''دولتِ اقوام'' (The Wealth of Nations) لکھی جو 1776ء میں پہلی دفعہ سامنے آئی۔

www.rahimia.org

یعنی ''**حُجّةُ اللّٰه البالغه**'' کے تقریباً چالیس سال بعد یہ کتاب سامنے آئی۔ کارل مارکس (م 1883ء) نے اینگلز (م 1895ء) کے تعاون سے 1848ء میں کمیونسٹ مینی فیسٹو (The Communist Manifesto) لکھا، جب کہ اس نے داس کیپٹل (Das Kapital) 1867ء میں لکھی ہے، جس میں کیپٹل (سرمایہ) پر بحث کی ہے۔ 1867ء میں سب سے پہلے جرمن زبان میں اس کی پہلی جلد سامنے آئی، جب کہ دوسری جلد 1885ء میں اور تیسری جلد 1894ء میں شائع ہوئی۔ اور 1887ء اور اس کے بعد اس کے انگلش اور دوسری زبانوں میں ترجمے ہوئے۔ اس کے بعد اس کتاب کا ''**رأس المالیه**'' کے نام سے عربی میں ترجمہ ہوا۔

آپ دیکھئے کہ کارل مارکس نے جو نظریۂ معیشت دیا ہے، اس سے تقریباً ڈیڑھ سو سال پہلے اور ایڈم سمتھ کی کتاب سے تقریباً چالیس سال پہلے شاہ صاحبؒ نے اپنی کتاب ''**حُجّةُ اللّٰه البالغه**'' لکھی ہے۔ یہ بھی ہم جانتے ہیں کہ ایڈم سمتھ کا زمانہ مرکنٹائل اِزم (Mercantilism) کا ہے۔ یہ تجارتی نظریۂ زر، یعنی زر کی اساس پر معیشت کی گردش کا زمانہ ہے۔ یہی نظریہ آگے چل کر کیپٹل اِزم کی اساس بنا۔ ارتقا کے اگلے مرحلے میں جب صنعت کا پہیہ تیز ہوتا ہے اور ''قدرِ زائد'' (Surplus value) پیدا ہوتا ہے تو کیپٹل (Capital) وجود میں آتا ہے اور اس طرح کیپٹل اِزم کا دور داخل ہوجاتا ہے۔

علمِ معیشت کی حقیقت

معاشی اصطلاحات کی زبان میں اگر ہم بات کریں تو علمِ معیشت کی تمام تر گفتگو کے دو بنیادی محور ہیں۔ علمِ معاشیات میں ان دونوں کے حوالے سے بات ہوتی ہے:

1۔ ایک یہ کہ انسانی احتیاجات اور ضروریات (Necessities) کا تعین۔ انسان کو کھانے پینے کی، گرمی سردی سے بچاؤ کی حاجت ہے۔ یعنی اپنی جسمانی ضرورتوں اور احتیاجات کی تسکین کی ضرورت ہے۔ اس طرح ''احتیاجات'' کا ایک کالم (column) بنا دیا۔ پھر اس میں بحث ہے کہ خواہش کیا ہے اور حاجت کیا ہے؟ یہ مستقل بحث ہے۔ بہرحال جو حاجات ہیں، ان کا قرار واقعی ہونا ضروری ہے۔

2۔ دوسرے یہ کہ وسائل (resources) کی دستیابی۔ وسائل موجود ہوں گے تو اس سے کسی نہ کسی انسانی ضرورت کی تکمیل ہوگی۔ اس طرح دوسرا کالم (column) ان احتیاجات کی تسکین کے لیے وسائل کا دستیاب ہونا ہے۔ وسائل معاش ایک تو قدرتی ہوتے ہیں اور دوسرے یہ کہ اُن وسائل معاش میں انسان محنت کر کے ایک افادیت (utility) پیدا کرتا ہے۔ وہ افادیت کسی نہ کسی حاجت کو پورا کرنے کے لیے کردار ادا کرتی ہے۔

علمِ معیشت کا دائرۂ کار

انسانی احتیاجات کی تسکین کے لیے وسائل کی دستیابی اور استعمال کے لیے بالترتیب چار امور کی ضرورت ہوتی ہے:

1۔ پیدائشِ دولت 2۔ تقسیمِ دولت 3۔ تبادلۂ دولت 4۔ صَرفِ دولت

امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے ایڈم سمتھ سے بھی چالیس سال پہلے ان چاروں کو علاحدہ علاحدہ بیان کیا۔ ارتفاقات کے مبحث میں جہاں معاشیات پر بحث کی، وہاں اسے بیان کیا ہے۔ خاص طور پر اپنی کتاب ''**البدور البازغه**'' میں شاہ صاحبؒ نے حکمتِ اکتسابیہ، حکمتِ تعاونیہ، حکمتِ تعاملیہ اور حکمتِ منزلیہ کے عنوانات سے انھیں تعبیر کیا ہے کہ:

www.rahimia.org

1۔ دولت کی پیدائش کے اصول اور ضابطے کیا ہونے چاہئیں؟

2۔ اس پیدا شدہ دولت کو عوامل پیدائش دولت (Factors of production of wealth) پر کیسے تقسیم کرنا ہے یعنی تقسیم کے اصول کیا ہوں گے؟

3۔ اسی طریقے سے خرید و فروخت اور لین دین میں سے کون سی بیع اور تبادلہ جائز اور درست، جب کہ فاسد اور باطل کون سا معاہدہ ہے اور دونوں کے درمیان کیا تعلق ہے؟ اس کی حکمت (logic) کیا ہے؟ شاہ صاحبؒ نے خرید و فروخت کے قوانین اور ضابطے بھی متعین کیے۔

4۔ پھر اس کے استعمالات بھی قرآن نے واضح کیے کہ کیسے اور کہاں دولت صَرف کرنی چاہیے؟

ان متعلقہ امور کو ایڈم سمتھ نے اپنی کتاب ''دولتِ اقوام'' میں (Production of Wealth) پیدائش دولت۔ پھر پیدا شدہ دولت کی تقسیم، (Distribution of Wealth)۔ پھر تقسیم شدہ دولت کا تبادلہ (Exchange of Wealth)، یعنی خرید و فروخت اور بیع، لین دین، اس کے اصول اور ضابطے اور قاعدے جب کہ تقسیم شدہ اور پھر تبادلہ شدہ دولت کے استعمال/ صَرف کو (Consumption of Wealth) کہا ہے۔

سرمایہ داری کے بانی ایڈم سمتھ نے مرکنٹائل دور (mercantilism) کے تقاضوں کے مطابق — ظاہر ہے کہ اس کے زمانے میں وہی تھی — اس پر گفتگو کی ہے۔ جیسے جیسے وقت گزرا تو سرمایہ داری کیمپ کے بعد میں آنے والے ماہرین معاشیات نے اسی تناظر میں اس کے انھیں پہلوؤں کو آگے بڑھا کر مزید تفصیل و تشریح واضح کی۔ اسی کو بنیاد بنا کر کارل مارکس نے گفتگو کی ہے۔ چوں کہ ایڈم سمتھ کے اس نظریے سے ''سرمایہ'' کا تصور وجود میں آیا، اس نے پیدائشِ دولت کے عمل کے تناظر میں سرمائے اور دولت کی اہمیت پر گفتگو کی، اس لیے داس کیپٹل میں مارکس نے علمی، فنی اور فلسفیانہ نقطہ نظر سے اور ریاضی اور الجبرا کے قوانین کی روشنی میں، حتیٰ کہ اپنے خاندانی یہودی مذہب، یعنی تورات کے تناظر میں بھی اس نے کیپٹل کی اس قرار واقعی حیثیت کو — جو ایڈم سمتھ نے مقرر کی تھی — فلسفیانہ دلائل کے ساتھ توڑا اور منطقی بنیادوں پر ردّ کیا۔

امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ ان دونوں سے پہلے ان چاروں پہلوؤں پر اسلام کی تعلیمات کو جمع کرتے ہیں۔ اس حوالے سے انھوں نے کتابِ مقدس قرآن حکیم کی متعلقہ آیات اور احادیثِ مبارکہ کے ذخیرہ کو مربوط طور پر واضح کیا۔

ایڈم سمتھ مکتبِ فکر کی نظر میں معیشت

ایڈم سمتھ مکتبِ فکر جب معیشت کی تعریف کرتا ہے تو کہتا ہے کہ معاشیات وہ علم ہے، جس میں انسانی احتیاجات کی تسکین کے لیے موجود دولت سے بحث کی جاتی ہے۔ اقوامِ عالم میں دولتِ اقوام (wealth of nations) کی نوعیت کیا ہے؟ یعنی اس نے دولت کو بنیاد بنایا ہے اور احتیاجات پر اس حوالے سے کوئی بحث نہیں کی کہ واقعی اور حقیقی احتیاجات کون سی ہیں؟ اور پھر ان احتیاجات کی تسکین کا نظام (procedure) کیا ہو؟ کیوں کہ اس کا موضوعِ بحث یہ ہے کہ دولت زیادہ سے زیادہ کیسے پیدا کی جائے؟ اور دولت زیادہ سے زیادہ اکٹھی کیسے کی جائے؟ دولت کا زیادہ سے زیادہ استعمال کیسے ممکن ہے؟ وغیرہ چوں کہ مرکنٹائل دورِ زر (Money) کے اکٹھا کرنے کا ہے، اس لیے سب سے بڑا اُس نے اصول دیا کہ دنیا میں مرکزی حیثیت زر کی ہے۔ اس

www.rahimia.org

لیے ہمیں اگر طاقت ور بننا ہے تو زر کو اپنے پاس رکھنا ہے۔ اس نے اس کا قانون اور ضابطہ بتلایا۔ ظاہر ہے کہ اس زمانے کا زر سونا چاندی تھا۔ زر کو قومی اور اجتماعی نقطۂ نگاہ سے جمع کیا جائے۔ باہر اس کی گردش روک دی جائے۔ باہر مال جانا چاہیے، جب کہ زر آپ کی طرف آنا چاہیے۔ جب کہ امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے سونا اور چاندی کے زر ہونے کی حیثیت کی زری حقیقت و نوعیت یا زری پالیسی پر بھی جامع گفتگو کی ہے کہ یہ سونا کیسے زر کے طور پر وجود میں آیا۔

ایڈم سمتھ کے ہاں پیدائش دولت، تقسیم دولت، تبادلہ دولت اور صرفِ دولت کے جو معیارات ہیں، اس کی اساس ارتکازِ زر پر ہے۔ اسی زر کو اکٹھا کرنے کے لیے ہی ایسٹ انڈیا کمپنی ہندوستان آئی تھی۔ سونے کی چڑیا (Golden Sparrow) کا عنوان اُن کے ہاں اسی لیے مشہور ہوا کہ ہندوستان کے پاس بڑا سونا ہے۔ شاہ جہان کے زمانے میں یہاں کا سب سے بڑا سکہ ایک سو پانچ تولے سونے کا تھا، جسے ''مہرِ شاہی'' کہا جاتا تھا۔ اکبر بادشاہ کے دور میں سونے کی پرکھ اور اس کی بہتر حالت کو زیادہ مرتب اور مربوط انداز میں ''آئینِ اکبری'' میں بھی واضح کیا گیا ہے۔ اسی تناظر میں زر کی تشکیل اور اس کی ٹکسالی حیثیت دنیا میں سب سے زیادہ ہندوستان میں مشہور تھی۔ ایڈم سمتھ کے اسی نظریے کے تحت ہی انگریز زر اکٹھا کرنے کے لیے یہاں آئے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی اسی اصول پر بنی۔ گویا کہ ان کے ہاں زر کے گرد تمام چیزیں گھومتی رہیں۔

صنعتی دور کے آنے کے بعد زر کو اگلے مرحلے میں سرمایہ (capital) قرار دیا گیا۔ جب پیداوار بڑھی اور اُون کی تجارت، نیل کی تجارت اور اسی طریقے سے آگے بڑھ کر صنعتی ترقی کے نتیجے میں جو نئی سے نئی چیزیں تیار ہوئیں، وہ یورپ سے باہر گئیں اور زر یورپ میں لایا گیا۔ سرمایہ داری نظام میں یہ بنیادی پالیسی رہی۔ یہی وہ اساس تھی، جو ایڈم سمتھ نے متعین کی۔ اس کے بعد بھی اس مکتبِ فکر کے جتنے ماہرینِ معاشیات آئے ہیں، انھوں نے دولت کے گرد ہی نظریات پیش کیے۔ گو الفرڈ مارشل (Alfred Marshall) نے اپنی کتاب ''اصولِ معاشیات'' (Principles of Economics) مطبوعہ 1890ء میں تھوڑی سی کوشش کی کہ احتیاجات کو بھی ساتھ داخل کرلیا جائے۔ کیوں کہ سرمایہ دارانہ معیشت پر اعتراضات شروع ہوگئے کہ یہ اَخلاقیات سے ماورا محض دولت سمیٹنے کا عمل ہے، جو انسانیت دشمنی کی بات ہے۔ تو اُس نے اپنی تعریف میں کسی قدر احتیاجات کو بھی ساتھ شامل کرنے کی کوشش کی، لیکن مرکز اور محور دولت ہی رہی۔

سوشلزم کے بانی مارکس کا نقطۂ نظر

اسی طریقے سے کارل مارکس (Karl Marx) نے جتنی بھی گفتگو کی ہے، وہ بھی اسی مطمحِ نظر سے ہے۔ اس نے یہ کہا کہ اس دولت کو آپ سرمایہ دار یا صنعت کار کو انفرادی ملکیت میں دیتے ہیں، جب کہ دولت کی انفرادی ملکیت کے بجائے ریاستی ملکیت ہونی چاہیے۔ گویا سرمائے کا استحصالی کردار ختم نہیں ہوا، بلکہ نقطہ نظر بدل گیا کہ کمیونزم میں دولت کا یہ اجتماع ریاست کے اِردگرد ہونا چاہیے۔ مارکس نے کہا کہ جو ''قدرِ زائد'' بھی پیدا ہوتا ہے، وہ مزدوروں کی محنت کی وَجہ سے ہوتا ہے۔ اسی کی اساس پر ''پرولتاریہ'' (Proletariat) کا تصور (concept) مارکس نے پیش کیا۔ اس نے کہا کہ چوں کہ مزدوروں کی اجتماعی کوشش اور کاوش سے یہ دولت پیدا ہوئی ہے، اس لیے اس کی مالک ریاست ہے۔ یا وہ انقلابی پارٹی جو مزدوروں کی آمریت کی اساس پر ہو، وہ اس دولت کے بارے میں فیصلہ کرے۔

www.rahimia.org

شاہ صاحبؒ کے نقطۂ نظر سے علم معاشیات کی تعریف

اب اس تناظر میں امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے معاشیات کی جو تعریف کی ہے، اس کا مطالعہ کیجیے۔ انھوں نے سب سے پہلے ''**حُجّةُ اللّٰه البالِغه**'' میں اسے بیان کیا۔ پھر ''**البُدور البازغه**'' میں شاہ صاحبؒ نے معاشیات کی بڑی جامع و مانع تعریف کی ہے۔ بڑی بدقسمتی کی بات ہے کہ آج ہماری معاشیات کی کتابیں اسلامی معاشیات کے نام سے بہت کچھ بیان کرتی ہیں، لیکن آپ کو ان کتابوں میں شاہ صاحبؒ کی یہ جامع تعریف نہیں ملے گی۔ شاہ صاحبؒ کی بیان کردہ تعریف کے الفاظ یہ ہیں:

''**الحكمة المعاشية: أن تستوفي حواجك علىٰ مراعاة، مقتضى الأخلاق الفاضلة من الدّيانة، و السّمت الصّالح وغيرهما، و مقتضى العلوم التّجربية، و الرّأى الكلى.**'' [5]

(معاشیات ایک ایسا علم ہے، جس میں انسانی فطرت کے بنیادی اَخلاق، دور کے تجرباتی علوم، اجتماعی مفاد کے تقاضوں کو سامنے رکھتے ہوئے انسانی احتیاجات کی تعیین اور ان کی تسکین کے لیے وسائل معیشت کے حصول سے بحث کی جاتی ہے۔)

شاہ صاحبؒ کی اس تعریف کے مطابق معاشیات دو کالموں پر استوار ہے:

1۔ انسانی احتیاجات کی تعیین کے معیارات

2۔ ان احتیاجات کی تسکین کے لیے حصولِ وسائلِ معاش کے معیارات

وہ وسائلِ معاش خواہ زر کی شکل میں ہوں، اجناس کی صورت میں ہوں، یا کسی اَور اثاثہ جات کی حالت میں ہوں۔ یہ وسائلِ معاش، انسانی احتیاجات اور ضروریات پوری کریں۔ سردی سے بچاؤ، کپڑا لتا، کھانا پینا وغیرہ جو بھی ہو۔ ان وسائل سے انسانی حاجات کی تسکین ہونی چاہیے۔ چناں چہ معاشی اور اقتصادی علم کا بڑا مقصد یہ ہے کہ اس کے ذریعے سے انسانی احتیاجات اور ضروریات کی تسکین کی جائے۔

اس حوالے سے سب سے پہلے تو احتیاجات کے تعین کا ایک معیار ہونا چاہیے۔ اگر ہر انسانی ''خواہش'' کو ''حاجت'' قرار دیا جائے تو ہر انسان میں تو معاشی حوالے سے ہزاروں سینکڑوں خواہشات ہیں۔ خواہشات کی نوعیت بہ قول غالبؔ یہ ہے کہ ؎

'ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے'

ہر خواہش تو پوری نہیں کی جاسکتی۔ احتیاجات کے تعین کا ایک معیار (criteria) ہونا چاہیے۔ ایسے ہی وسائل کی پیدائش، تقسیم، تبادلہ اور اُن کے صَرف اور استعمال کے بھی کچھ معیارات طے ہونے چاہئیں کہ پیدائش دولت کس اصول پر ہوگی؟ پیدا شدہ دولت کی تقسیم کس اصول پر ہوگی؟ تقسیم شدہ دولت کے تبادلے کے کیا اصول ہیں؟ تقسیم شدہ اور تبادلہ شدہ دولت کا صَرف یا استعمال کیسے ہوگا؟

1۔ احتیاجات کے تعین اور وسائل معاش کے حصول کے تین معیارات

اس حوالے سے شاہ صاحبؒ نے احتیاجات کی تعیین اور وسائلِ معاش کے حصول کے لیے تین معیارات قائم کیے ہیں:

ا۔ کل انسانیت کے متفقہ اعلیٰ اَخلاق: شاہ صاحبؒ نے علمِ معاشیات کی تعریف میں پہلا معیار یہ مقرر کیا ہے کہ:

www.rahimia.org

(الف) ''مقتضى الأخلاق الفاضلة'' (یعنی اعلیٰ اَخلاق کے تقاضوں کی رعایت رکھی جائے)۔

شاہ صاحبؒ کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ عرب وعجم اور دنیا بھر کے تمام مذاہب اور ملتوں کا جائزہ لیں۔ جن اعلیٰ اَخلاق پر دنیا متفق ہے، مثلاً آزادی اور حریت، شجاعت اور بہادری، عفت وعصمت وغیرہ وغیرہ کو معاشی وسائل کے حصول اور احتیاجات کے تعین کے لیے پیش نظر رکھا جائے۔ شاہ صاحبؒ نے فلسفہ یونان سے لے کر اپنے زمانے تک کے فلسفیوں اور مذاہب کی تعلیمات؛ بدھ اِزم، یہودیت، عیسائیت اور اسلام کے تناظر میں ممکنہ طور پر جو اَخلاقِ فاضلہ متعین ہو سکتے تھے، انھیں ''البُدور البازغہ'' میں بیان کیا ہے۔ اس حوالے سے انھوں نے سات بنیادی اَخلاقِ فاضلہ (حکمت، عفت، سماحت، شجاعت، فصاحت، دیانت، اور سمت ِصالح) متعین کیے ہیں۔ شاہ صاحبؒ نے کہا کہ مہذب انسانی معاشرے کی تشکیل کے لیے جو بھی تمام قوموں میں متفقہ اَخلاقِ فاضلہ ہیں، ان کو احتیاجات کے تعین میں اور وسائل کی پیدائش، تقسیم، تبادلے اور صَرف میں بھی پیش نظر رکھا جائے۔ جو انسانی حاجت اور ضرورت ان اَخلاق کے معیار پر پورا اُترتی ہے، وہ درست ہے۔ جو خواہش ان اعلیٰ اَخلاق کے منافی ہے، وہ محض خواہش ہے۔ انسان کی حقیقی حاجت اور ضرورت نہیں ہے۔ اسی طرح وسائل معاش کے حصول کے تمام مراحل میں ان اَخلاق کی رعایت رکھنا اور ان کے تقاضوں کو پورا کرنا ضروری ہے۔

۲۔ دور کے تجرباتی علوم اور دریافت شدہ ٹیکنالوجیز کو پیش نظر رکھنا:

شاہ صاحبؒ نے علم معاشیات کی تعریف میں دوسری بات یہ کہی ہے:

(ب) ''مقتضى العلوم التّجربية'' (یعنی تجرباتی علوم کے تقاضوں کی رعایت رکھنا)۔

انسانی احتیاجات کے صحیح تعین اور اُن کی درست تسکین کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ اپنے دور کے تجرباتی علوم کو سامنے رکھا جائے۔ چناں چہ معاشی نظام میں ہر دور میں وجود میں آنے والے تجربات اور مشاہدات سے نئے نئے علوم اور ٹیکنالوجی دریافت ہوئی ہے، انھیں بروئے کار لایا جائے۔ ظاہر ہے ذرائع پیداوار یا وسائل کے حصول کے پیداواری رشتے مسلسل ارتقا پذیر رہے ہیں۔ پتھر کا ایک دور گزرا ہے، جس میں صرف قدرتی وسائل کی بنیاد پر معیشت وجود میں آتی ہے۔ پھر غلام داری دور آیا، پھر فیوڈل اِزم یا زمین کی اساس پر تمام پیداواری رشتے وجود میں آئے۔ فیوڈل اِزم کے بعد مرکنٹائل اِزم کا دور آیا۔ جب تجارت اور خرید وفروخت کی بنیاد پر زر اور پیسے کا استعمال شروع ہوا۔ پھر بڑھتے بڑھتے صنعتی ارتقا کی مختلف شکلیں سامنے آئی ہیں۔

شاہ صاحبؒ نے کہا کہ جو بھی کسی دور کی ٹیکنالوجی دریافت ہو چکی ہو، چیزوں کی پیدائش، تقسیم، تبادلے اور صَرفی استعمالات کے حوالے سے اور انسانی احتیاجات کی صحیح تعیین کے لیے اسے پیش نظر رکھا جائے۔ مثلاً ایک غلام داری دور کے انسان کی حاجت ہے اور ایک آج کے دور (Digital Age) کے انسان کی حاجت ہے۔ دونوں حاجتوں کی نوعیت میں فرق ہوگا۔ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ آج کا انسان پچھلے زمانے میں لوٹ کر اُسی زرعی معیشت کے دور میں زندگی بسر کرنے کے معیارات کے مطابق اپنی حاجت پوری کرے۔ ایک زمانے میں مثلاً موبائل فون کوئی حاجت نہیں تھی، آج حاجت ہے۔ تو علومِ تجربیہ، یعنی ٹیکنالوجی کی نئی دریافتوں سے جو نئی ضرورتیں یا احتیاجات سامنے آتی جائیں، اُن کی روشنی میں دولت کی پیدائش بھی ہوگی، تقسیم بھی ہوگی، تبادلہ بھی ہوگا۔ اور اس کے استعمالات کے ضابطے اور قوانین بھی بنائے جائیں گے۔

www.rahimia.org

۳۔ اجتماعی مفادِ عامہ کو پیش نظر رکھنا: تیسری بات شاہ صاحبؒ نے معاشیات کی اس تعریف میں یہ کہی ہے:

(ج) ''مقتضی الرّأی الکلی'' (یعنی اجتماعی مفادِ عامہ کے تقاضوں کی پوری رعایت رکھی جائے)۔

انسانی احتیاجات اور ان کی تسکین کے لیے پیدا شدہ وسائل کا حصول سوسائٹی کے اجتماعی مفادِ عامہ کے تناظر میں ہونا چاہیے۔ اس لیے کہ ایک آدمی اپنی حاجت اور ضرورت پورا کرتے ہوئے اجتماعی مفاد کو نظرانداز کر دیتا ہے۔ اس طرح انفرادی نقطۂ نظر سے اپنی حاجت اور ضرورت پوری کرنے سے باقی اجتماع کو نقصان پہنچتا ہے۔ مثلاً وہ کوئی ایسی فیکٹری اور کارخانہ بناتا ہے، جس سے نکلنے والی آلودگی سوسائٹی کو نقصان پہنچاتی ہے۔ یا وہ ایسے طریقے سے کاروبار (business) کرتا ہے کہ کسی سوسائٹی میں بسنے والے باقی لوگوں کے اجتماعی مفاد کو نقصان پہنچتا ہے۔ یا زراعت اور کاشت کاری ایسے کرتا ہے، جو باقی لوگوں کے اجتماعی مفاد کے لیے نقصان کا باعث ہے۔

ارتفاقات پر بحث کرتے ہوئے شاہ صاحبؒ نے ایک اصطلاح ''الـرّأی الـكُلّـی'' (اجتماعی مفادِ عامہ کی فکر) استعمال کی ہے۔ جب کہ اس کے بالمقابل دوسری اصطلاح ''الـرّأی الجُـزئـی'' (انفرادیت پر مبنی سوچ) ہے۔ (ان شاء اللہ ارتفاقات کی بحث میں اس پر مفصل گفتگو کی جائے گی۔) ''رأی کُلّی'' میں مفادِ عامہ اور اجتماعیت کے تقاضوں کو پیش نظر رکھا جاتا ہے۔ ''رأی جُزئی'' میں انفرادی نقطۂ نظر میں سے ذاتی مفادات اور گروہی مفادات کے تابع بات آگے بڑھتی ہے۔

شاہ صاحبؒ نے کہا کہ معاشی احتیاجات کی تعیین اور معاشی وسائل سے اُن کی تسکین بھی پورے معاشرے کے مجموعی مفاد کو سامنے رکھ کر متعین کی جائے گی۔ کسی خاص فرد، طبقے یا نسل یا خاص فرقے کی اساس پر احتیاجات کا تعین نہیں ہوگا اور نہ ہی اس کی تسکین کا طریقۂ کار ایک مخصوص طبقے کے مفادات کے تناظر میں تعیّشات کی بنیاد پر ہوگا، بلکہ اجتماعی مفادِ عامہ کے تناظر میں ہوگا۔ شاہ صاحبؒ کے نزدیک یہ تین معیارات ہیں: پہلا اَخلاقِ فاضلہ، دوسرا علومِ تجربیہ، تیسرا الـرأی الـکـلـی۔ ان معیارات کے مطابق احتیاجات کی تسکین بھی اور وسائل کی پیدائش، تقسیم، تبادلہ اور صرف کے امور میں پیش نظر رکھنا علمِ معاشیات ہے۔

شاہ صاحب کے نقطۂ نظر کی جامعیت

آپ دیکھیے کہ علم معیشت کے حوالے سے کوئی ایسا پہلو نہیں ہے، جو اس تعریف کے دائرے سے خارج ہو۔ اس تعریف کے مطابق علم معاشیات کی بنیاد خود انسان ہے۔ کیوں کہ انسان کی احتیاجات ہیں۔ انسان نے ہی دولت پیدا کرنی ہے۔ انسان نے ہی اس کی تقسیم کرنی ہے۔ انسان ہی کے مفاد کے لیے اُس کی خرید وفروخت ہے۔ انسان ہی کے مفاد کے لیے اس کی احتیاجات کی تسکین کے لیے دولت کی تقسیم اور صَرف کرنے کا سسٹم قائم ہونا ہے۔ اس تعریف سے ہی معیشت کا بنیادی فلسفہ واضح ہو جاتا ہے کہ معاشی امور میں اصل اہمیت انسانیت کی ہے۔ جیسا کہ ارشادِ خداوندی ہے:

وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْٓ اٰدَمَ وَحَمَلْنٰهُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَرَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ وَفَضَّلْنٰهُمْ عَلٰى كَثِيْرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيْلًا ۝[6] (اور ہم نے آدم کی اولاد کو عزت دی ہے، اور خشکی اور دریا میں اُسے سوار کیا، اور ہم نے انھیں ستھری چیزوں سے رزق دیا، اور اپنی بہت سی مخلوقات پر انھیں فضیلت عطا کی۔)

اس آیت سے معلوم ہوا کہ تمام انسانوں کو معزز اور مکرم بنایا گیا ہے اور ان تمام کے لیے پاکیزہ رزق خشکی اور تری میں رکھا گیا ہے۔ اس لیے معاشی نظام بناتے ہوئے انسانیت کی عزت واحترام اور اس کے اشرف المخلوق ہونے کی فضیلت کو سامنے رکھا

www.rahimia.org

جائے گا۔ نیز قرآن حکیم میں ارشادِ ربانی ہے:

وَلَقَدْ مَكَّنّٰكُمْ فِي الْاَرْضِ وَجَعَلْنَا لَكُمْ فِيْهَا مَعَايِشَ ۭ قَلِيْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ (7)

(اور ہم نے تمھیں زمین میں جگہ دی، اور اس میں تمھاری زندگی کا سامان بنا دیا، تم بہت کم شکر کرتے ہو۔)

یہ آیت واضح طور پر بتلاتی ہے کہ معاشیات کا دار و مدار انسانی احتیاجات کی تسکین اور وہ بھی پورے اجتماع کے لیے ہے۔ اصولِ فقہ کا قاعدہ و ضابطہ آپ نے فقہ کی کتابوں میں پڑھا ہوگا۔ بالخصوص فقہی کتب پڑھنے والے تو ضرور جانتے ہیں کہ جب جمع جمع کے مقابلے پر آئے تو مساوات پر دلالت کرتی ہے۔ (8) اس کی مثال یہ ہے کہ کوئی آدمی دس روپے دے کر دس آدمیوں سے کہے کہ یہ تمھارے لیے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر ایک کے لیے ایک ایک روپیہ ہے۔ یہ نہیں ہے کہ نو روپے ایک آدمی کے ہوں اور ایک روپے میں باقی نو شریک ہیں۔ اصول اور ضابطہ یہ ہے کہ کسی ملک کے تمام معاشی وسائل میں وہاں بسنے والے تمام لوگوں کا مساوی حق ہے۔ اس قرآنی آیت کی روشنی میں کل انسانیت کے لیے تمام زمینی وسائل ہیں۔ اس طرح اسلام کے اقتصادی نظام کا بنیادی اصول ''حقِ معیشت میں مساوات'' کا ہے، یعنی قدرتی اور قومی وسائل میں تمام لوگوں کو مساوی طور پر استعمال کا حق حاصل ہے۔ (9)

سرمایہ داری نظام کے فکر و فلسفے کا تجزیہ

فلسفۂ معیشت کے حوالے سے بھی درست تجزیہ ہمارے سامنے رہنا چاہیے۔ آج سرمایہ داری نظام اور سوشلزم کا بڑا شور وغوغا ہے۔ آپ دیکھئے کہ ان کے فلسفۂ حیات کی بنیاد انسان نہیں ہے۔ ان کے فلسفۂ حیات کی بنیاد دولت اور سرمایہ ہے۔ ان کے نزدیک انسانیت کا وجود ایک مادی شئے کے طور پر ہے۔ اُن کے پیشِ نظر اس کے محض جسمانی اور حیوانی تقاضے ہیں۔ انھوں نے انسان کے جسمانی اور حیوانی تقاضوں کی تکمیل کے لیے مادی نقطۂ نظر سے چیزوں کے استعمالات پر بحث کی ہیں۔

یہی وَجہ ہے کہ سرمایہ داری نظام نے سرمایہ (Capital) کو اصل قرار دیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ سرمایہ (Capital) ہی اصل ہے، جب کہ انسان اُس کیپٹل کے لیے ہے۔ جب بھی کیپٹل استعمال میں آئے گا تو اس کی واپسی (return) چاہیے ہوگی۔ اس سے سرمایہ کو کوئی غرض نہیں کہ انسانیت خواہ تباہ و برباد ہو یا ذلت اور رُسوائی میں مبتلا ہو۔ اس لیے سود وغیرہ کی مضرت کی بحث ان کے ہاں کچھ نہیں۔ جہاں سے بھی کیپٹل کا return حاصل ہو، اس کو نگل لو کا اصول ہے۔ گویا کہ اصل سرمایہ ہے، انسان نہیں۔

یورپ نے اسی لیے مذہب کو بھی چھوڑا۔ یہودیت اور عیسائیت جیسے مذہبوں کو چھوڑ کر ''اَخلاقِ فاضلہ'' کے دائرے سے اپنے آپ کو آزاد کر دیا۔ تجرباتی علوم ضرور انھوں نے لیے، لیکن تجرباتی علوم کا صنعت و حرفت میں استعمال بھی سرمائے اور دولت کے ارتکاز اور پھیلاؤ اور منڈیوں پر قبضہ کرنے کے لیے کیا۔ حال آں کہ اصولاً ٹیکنالوجی کا استعمال تو اس لیے کیا جاتا ہے کہ انسان کے لیے سہولت پیدا ہو، مگر انسان کے بجائے سہولت کس کو پیدا ہوئی؟ سرمائے کو، یا سرمائے کے مالک سرمایہ دار کو۔ گویا ''اَخلاقِ فاضلہ'' بھی اُن کے پیشِ نظر نہیں رہے کہ اَخلاق کا معاشیات سے ربط ختم ہو کر رہ گیا۔ اسی طرح انھوں نے ''رأیِ کلی'' کو بھی پسِ پشت ڈال دیا۔ اس طرح انھوں نے اجتماعی مفادِ عامہ کو بھی پیش نظر نہیں رکھا۔ اسی لیے انفرادی طور پر سرمایہ دار اور ایک مخصوص طبقہ امیر سے امیر تر بننے کے چکر میں اُن علومِ تجربیہ کا ذاتی اور گروہی استعمال کرتا رہا ہے۔

www.rahimia.org

ایک اَور حقیقت بھی ہمیں سامنے رکھنی چاہیے کہ قدیم زمانے سے تجرباتی علوم اور سائنس جب بھی کوئی نئی چیز اور ٹیکنالوجی دریافت کرتی ہے تو اس کا مقصد انسانوں کے لیے کسی نہ کسی سہولت کو پیدا کرنا ہوتا ہے۔ اس لیے وہ انسانیت کی مشترکہ میراث ہوتی ہے اور اجتماعیت کے مفاد کے لیے استعمال ہوتی ہے۔ لیکن اگر اسی ٹیکنالوجی سے انسانیت کو فائدہ پہنچانے کے بجائے مخصوص سرمایہ دار طبقے کو فائدہ پہنچایا جائے تو یہ اس ٹیکنالوجی کا غلط استعمال ہے۔ اس لیے کہ ٹیکنالوجی بہ ذاتِ خود بُری نہیں ہوتی، بلکہ اُس کا استعمال بُرا ہوتا ہے۔ ہمارا مذہبی طبقہ بسا اوقات سرمایہ داری اور جدید مادیت کے خلاف بات کرتا ہے تو سائنس و ٹیکنالوجی کا بھی سِرے سے انکار کر دیتا ہے۔ حال آں کہ ٹیکنالوجی تو انسانی فائدے کے لیے ہوتی ہے مگر اس کے استعمال کے دو طریقے ہیں کہ مخصوص طبقے کے مفاد کے لیے ہو یا پوری سوسائٹی کے لیے۔ گویا اس کے استعمالات سے بحث ہے۔

عاملینِ پیدائش کی بحث

سرمایہ داری نظام سرمائے کو دیوتا بنا کر انسانیت کو اس کے اردگرد گھماتا ہے۔ اس کا اظہار دولت کی پیدائش، تقسیم، تبادلہ اور صَرف کے چاروں شعبوں میں ہوتا ہے۔ چناں چہ سرمایہ داری نظام میں عاملینِ پیدائشِ دولت کے حوالے سے سرمایہ کو بالادستی حاصل ہے۔ عام طور پر چار عاملینِ پیدائشِ دولت (Factors of production of wealth) بیان کیے جاتے ہیں:

1۔ سرمایہ (Capital)   2۔ محنت (Labour)   3۔ زمین (Land)   4۔ تنظیم (Organization)

بہ ظاہر کہنے کو تو یہ چار عاملین کہے جاتے ہیں، لیکن اگر سرمایہ دارانہ نقطہ نظر سے ان کا جائزہ لیا جائے تو عملاً کیپٹل کے مالک سرمایہ دار کو بالادستی حاصل ہے۔ عام طور پر ''زمین'' (Land) اکنامکس کی اصطلاح کے مطابق الگ عامل ہے، مگر اس کو الگ بنانے کا کوئی علمی اور منطقی اصول موجود نہیں۔ وہ بھی دراصل کیپٹل سے متعلق اثاثے میں شمار ہوتی ہے۔ اسی طرح آرگنائزیشن بھی دراصل سرمایہ دار کی انتظامی صلاحیت پر مبنی ذہنی محنت ہی ہوتی ہے۔ اُسے بھی محنت (Labour) میں شمار کرنا چاہیے۔ اس طرح حقیقت میں عاملینِ پیدائشِ دولت دو ہی بنتے ہیں: (۱) سرمایہ اور (۲) محنت۔

سرمایہ دارانہ نقطہ نظر سے محنت (Labour) کے بارے میں ایک قانون معاشیات کی کتابوں میں یہ پڑھایا جاتا ہے کہ لیبر کے پاس بھاؤ تاؤ (bargaining) کی قوت (power) نہیں ہوتی۔ اس لیے کہ اگر ایک مزدور کو ایک دن مزدوری نہیں ملی تو اس کی محنت کا وہ دن ضائع ہو گیا۔ اس لیے وہ مجبور ہو کر مثلاً 200 روپے کی مزدوری کے بجائے 100 روپے کی مزدوری کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ اُسے مجبور کر دیا جاتا ہے کہ اگر یہ 100 بھی مزدوری میں نہ لیے تو اس دن کی محنت بیچنے کے لیے اس کے پاس محفوظ نہیں ہے۔ جب کہ سرمایہ دار کے پاس سرمایہ برقرار رہتا ہے۔ اگر کسی دن اُس میں کام نہیں بھی ہوتا تو بہرحال سرمایہ محفوظ رہتا ہے۔ اس طرح بارگیننگ پاور نہ ہونے کی وجہ سے محنت کو دوسرے، تیسرے، بلکہ چوتھے درجے میں منتقل کر دیا جاتا ہے۔

امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے اس پر سخت تنقید کرتے ہوئے یہ واضح کیا ہے کہ

''فإنّ المفلس یضطرّ إلٰی التزام ما لا یقدر علٰی ایفائہ، و لیس رضاہٗ رضاً فی الحقیقۃ، فلیس من العقود المرضیّۃ، و لا الأسباب الصّالحۃ، و إنّما ھو باطل و سحت بأصل الحکمۃ المدنیۃ.'' [10]

(ایک مفلس اور نادار اپنی معاشی پریشانیوں کی وَجہ سے ایسی ذمہ داریوں کا بوجھ اُٹھا لینے پر مجبور ہو جاتا ہے، جن کو پورا

www.rahimia.org

کرنے کی اپنے میں طاقت نہیں پاتا (یا ایسی کم اُجرت پر کام کرنے پر مجبور ہوجاتا ہے، جسے وہ اپنی ضروریات کے لیے ناکافی سمجھتا ہے۔) اس کی ایسی رضامندی حقیقت میں رضامندی نہیں ہے۔ یہ بات پسندیدہ معاہدات میں سے نہیں ہے اور نہ ہی یہ معیشت کے اصول کے صحیح اسباب میں ہے۔ یہ اصولِ تمدن کے مطابق سِرے سے باطل اور حرام معاملہ ہے۔)

شاہ صاحبؒ نے کہا کہ اس قسم کا ہر عقد جو کسی بھی مزدور کے ساتھ کیا جائے، یہ دراصل اس معاہدۂ اُجرت کے سراسر خلاف ہے۔ وہ باطل اور سُحت یعنی حرام ہے۔ بہ ظاہر اس کے جواز کے لیے کہا جاتا ہے کہ مزدور خود کم مزدوری پر کام کرنے کے لیے مان گیا اور کم تنخواہ پر کام کرنے کے لیے تیار ہے۔ مگر یہ ماننا تو اضطراری طور پر مجبوری سے ہوتا ہے۔ جب کسی معاملے میں جبر یا اضطرار کی کیفیت پیدا ہوجائے تو یہ معاہدہ باطل اور حرام ہے۔

پیدائش اور تقسیم دولت میں استحصالی نوعیت

اس طرح آپ دیکھیے کہ عاملینِ پیدائشِ دولت کی بحث میں ''زمین'' بھی سرمایہ دار کا اثاثہ، ''سرمایہ'' بھی اُسی کا اور ''تنظیم'' بھی اُسی کی۔ باقی رہی مزدور کی ''محنت'' تو اس میں بارگیننگ کی پاور نہ ہونے کی وَجہ سے اس کے حصے میں انتہائی قلیل مزدوری آئی۔ چناں چہ پیدا شدہ دولت کا 3/4 حصہ بلکہ اس سے بھی زائد سرمایہ دار کی جیب میں چلا گیا۔ اس طرح سرمائے سے خریدے گئے میٹریل اور اس میں مزدور کی محنت سے جو ''قدرِ زائد'' پیدا ہوئی، اسے نفع (profit) کے نام پر سرمایہ دار نے ہڑپ کرلیا۔ اس طرح سب کا سب سرمایہ دار کے قبضے میں چلا گیا، مزدور کے پاس کچھ نہیں آیا اور اگر آیا بھی تو بہت معمولی سا حصہ۔ اس طرح عاملین پیدائش دولت کی جو بحث عام طور پر معاشیات کی کتابوں میں پڑھائی جاتی ہے، اس کا تمام تر فائدہ سرمایہ دار کے لیے ہوتا ہے۔ اسی کے نتیجے میں سرمائے کی بالادستی کی اساس پر دولت کی تقسیم کی بھی نوعیت ہوتی ہے، اس لیے کہ جو عاملین پیدائش دولت ہیں، تقسیم دولت بھی انھیں عاملین پر ہوتی ہے۔ اس طرح پیدائش دولت اور تقسیم دولت دونوں ہی ظالمانہ تفاوت پر مبنی ہوتے ہیں۔

تبادلۂ دولت میں استحصالی نوعیت

جب تبادلہ دولت کا معاملہ آتا ہے تو وہی پروڈکٹ (product) جو مثلاً 10 روپے میں تیار ہوئی ہے، اسے تیار کرنے والے سے لے کر عام صارف تک پہنچنے تک درمیان کے تاجروں اور ڈسٹری بیوٹرز کے ذریعے سے اُس کی قیمت میں اتنا اضافہ ہوجاتا ہے کہ پیدا کرنے والے کو اتنا فائدہ نہیں ہوتا، جتنا درمیان کا مڈل مین (middle man) اور کمپنیاں فائدہ اٹھاتی ہیں۔ اس طرح سرمایہ داری نظام میں نیشنل اور ملٹی نیشنل کمپنیاں دونوں طرف کے لوگوں کا استحصال کرتی ہیں۔ اس طرح تبادلۂ دولت کا جو حقیقی عمل اور ضابطہ ہے، وہ بھی ختم ہوجاتا ہے۔ اسلام میں تمام بیوعاتِ فاسدہ اسی لیے حرام ہیں کہ یا تو وہ ''مُفضی الیٰ المنازعہ'' یعنی دونوں فریقوں میں جھگڑا پیدا کرنے کا سبب بنتی ہیں اور یا دونوں ''عاقدین'' یعنی بائع اور مشتری کے درمیان معاملے میں کسی ایک فریق کو بالادستی حاصل ہوتی ہے کہ وہ من مانی قیمت پر چیز بیچتا یا خریدتا ہے۔ آج مثلاً کاشت کار کو بیج، کھاد اور باقی تمام چیزیں غلہ منڈی میں بیٹھا ہوا کمیشن ایجنٹ (commission agent) اپنی قیمت پر بیچتا ہے۔ جب اُس کی فصل غلہ منڈی میں آتی ہے تو اس کی قیمت مقرر کرنے کا اختیار بھی کاشت کار کو نہیں ہوتا، بلکہ وہی ایجنٹ اسے بھی اپنے ہاتھ میں لے لیتا ہے۔ وہ اسے کم سے کم دام پر اس کی ادائیگی کرتا ہے۔ سرمایہ داری نظام کی یہی خرابی ہے کہ جب وہ خود بیچتا ہے تو اس میں ڈنڈی مارتا ہے اور دوسرے

www.rahimia.org

سے خریدتا ہے تو اس سے پورا پورا تو کیا، اس سے زیادہ لینے کی تگ ودو کرتا ہے۔ یہی تو ''تطفیف'' (ناپ تول میں کمی زیادتی) ہے۔ اس کے بارے میں قرآن حکیم کہتا ہے:

وَيْلٌ لِّلْمُطَفِّفِيْنَ ۝ الَّذِيْنَ اِذَا اكْتَالُوْا عَلَى النَّاسِ يَسْتَوْفُوْنَ ۝ وَ اِذَا كَالُوْهُمْ اَوْ وَّزَنُوْهُمْ يُخْسِرُوْنَ ۝ [11] (بربادی ہے کمی کرنے والوں کے لیے۔ وہ جب لوگوں سے ماپ کر لیتے ہیں تو پورا پورا لیتے ہیں اور جب ان کو ماپ کر دیتے ہیں یا تول کر دیتے ہیں تو کمی کرتے ہیں۔)

صرفِ دولت میں اختیار کی جانے والی خرابیاں

پھر جب بے تحاشا دولت سرمایہ دار کے پاس آتی ہے تو وہ اُسے بے محابا اِسراف یعنی ملکی اور قومی دولت کا بے جا اور فضول خرچ کرتا ہے۔ جہاں ضرورت نہیں ہے، وہاں بھی خرچ کرتا ہے۔ ظاہر ہے ساری دولت کھا تو نہیں سکتا مگر لالچ کی وَجہ سے پیٹ پھر بھی نہیں بھرتا۔ دوسری طرف محنت کش آدمی (laboures) نانِ جویں کا محتاج اور اپنی ضرورتوں کو پورا کرنے سے بے چارہ قاصر ہے۔ اس کے پاس اپنی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے بھی پیسے نہیں ہوتے۔ یوں معاشرے میں وہ تمام خرابیاں پیدا ہوتی ہیں، جو پہلے لیکچر (مجلّہ ''شعور و آگہی''، ج:10، شمارہ4) میں شاہ صاحبؒ کے خیالات کے تناظر میں بیان کی گئی تھیں کہ دونوں طبقے ہی دین سے دور ہونا شروع ہوجاتے ہیں۔ وہ اخلاقِ فاضلہ کے دائرے سے نکل جاتے ہیں اور سوسائٹی کے مسائل حل کرنے سے قاصر ہوجاتے ہیں۔ الغرض! سرمایہ دارانہ فلسفہ معیشت سرمائے (Capital) کو اصل بنا کر انسانوں کو اُس کے گرد گھماتا ہے۔

کیمونزم کی فلاسفی کا تحلیل و تجزیہ

اب آیئے کیمونزم یا سوشلزم کی طرف۔ بہ ظاہر سرمایہ داری نظام کے مقابلے پر کیمونزم نے اپنے تصورات پیش کیے اور کہا کہ سرمایہ (Capital) اصل عاملِ پیدائشِ دولت نہیں ہے، بلکہ مزدور اور لیبر کی محنت اصل ہے۔ سرمائے کو ریاست کی ملکیت قرار دے کر مزدوروں کی اجتماعی محنت کو ریاست کنٹرول کرے۔ اُسے اشتراکیت کی صورت میں ریاست کے قبضے میں ہونا چاہیے۔

مارکس چوں کہ فلسفی ہے اور وہ فلسفے کے استاد ہیگل (م 1831ء) کا شاگرد ہے۔ جس نے جدلیت کا نظریہ (Dialectic Idealism) دیا۔ ہیگل کے فلسفے کے کچھ حصے مارکس نے لے لیے۔

واضح رہے کہ یورپین اقوام مذہب کے انکار کے بعد درجِ ذیل ان چار فلسفوں سے متأثر ہوئیں، جنھوں نے یورپ کی نشاتِ ثانیہ میں کردار ادا کیا۔ وہ چار فلسفے یہ ہیں:

1۔ فیورباخ (م 1872ء) کا نظریۂ مادیت
2۔ روسو (م 1778ء) کا نظریۂ اجتماع
3۔ ڈاروِن (م 1882ء) کا نظریۂ ارتقا
4۔ ہیگل (م 1831ء) کا نظریۂ جدلیت

(ان کی تفصیلات بیان کرنے کا یہ موقع نہیں ہے۔ اپنی بعض تحریرات میں ہم نے ان کی کچھ تفصیلات بیان کی ہیں۔ [12])

یورپین اقوام کے فلسفیوں پر ان چاروں فلسفوں کے اثرات ہیں، جس کے ملغوبے سے سرمایہ داری نے جنم لیا اور اسی کی اگلی شکل کیمونزم کی صورت میں سامنے آئی۔

www.rahimia.org

ہیگل کا نظریہ جدلیت

ہیگل (Hegel) (1770ء - 1831ء) نے کہا: ''تمام معاشرتی اور فطری اعمال تغیر پذیر ہیں۔ یہ تبدیلی کسی بیرونی قوت کا نتیجہ نہیں، بلکہ ہر شئے کے اندرونی تضاد کا نتیجہ ہوتی ہے۔ یہ تضاد تبدیلی کا محرک ہے۔'' چناں چہ انسان سمیت تمام اشیا میں جدل کا عمل جاری ہے۔ اس طرح اُس نے جدلیاتی (Dialectical) نظریات پیش کیے۔

انسان میں جدل ہے۔ اُس کی فطرت میں لڑائی ہے۔ اس نے یہ ایک تصور (concept) دیا۔ تاریخ پر بھی اُسے منطبق (fit) کیا۔ مادیت پر بھی، فزکس، کیمسٹری وغیرہ پر بھی کہ کائنات میں جدل جاری ہے۔ اس نے کہا کہ ایک Thesis ہوتا ہے۔ یعنی آپ نے دعویٰ اور فکر پیش کیا۔ کچھ عرصہ وہ Thesis چلتا ہے۔ پھر اُس کے ردِعمل سے ایک Antithesis پیدا ہوتا ہے۔ اب اس Thesis اور Antithesis میں جدل ہوتا ہے۔ اور اس جدل کے نتیجے میں کچھ عرصے بعد امتزاج یعنی Synthesis وجود میں آتا ہے۔ پھر یہ Synthesis کچھ عرصے کے بعد خود Thesis بن جاتا ہے۔ پھر اس کا ایک ردِعمل پیدا ہوتا ہے۔ اور پھر اس مخالف اور Thesis کے درمیان لڑائی ہوتی ہے۔ تو اُس کا کہنا ہے کہ شروع سے انسانیت میں جو مادی ارتقا کا نظریہ چلا آ رہا ہے، وہ Thesis اور Antithesis کے جدل کا کھیل ہے۔ جب بھی Thesis اور Antithesis میں ٹکراؤ ہوتا ہے تو Synthesis اس کی اشتراکی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ یعنی اس جدل کے نتیجے میں ایک مشترک چیز وجود میں آتی ہے۔ یہی اشتراکیت ہے۔

اب ہیگل کے فلسفے پر جب یہ سوالات ہوئے کہ آخر اس کائنات میں یہ جدل کیوں جاری ہے؟ فکر میں بھی، تاریخ میں بھی، سیاست میں بھی، معیشت میں بھی، افکار و خیالات میں بھی اور باقی تمام مادی چیزوں میں بھی۔ تو ہیگل نے جواب دیا تھا کہ اس کائنات کی ایک ''روح الکل'' ہے اور وہ بے چین ہے۔ اُس کو اپنے ارتقا کے لیے اس جدل کی ضرورت ہے یعنی یہ ایک عالم گیر روح کے تابع کام ہو رہا ہے۔ ایک مرحلے پر جب کائنات مکمل ہو جائے گی، تو یہ جدل بھی ختم ہو جائے گا۔ یعنی اُس کے نزدیک تو یہ جدل اُس ایٹمی ری ایکٹر کے گنبد کے اندر تھا، جس کو اُس نے روح کہا، گویا اُس نے کسی درجے میں روحانیت کی بات کی۔

مارکس نے آ کر کہا کہ ہیگل نے یہ جو روح الکل کی بات کی ہے، یہ عینیت پسند فلسفیوں کی بات ہے۔ یہ تو تخیلاتی بات ہے جب کہ روح وغیرہ کچھ نہیں ہوتی۔ محض مادی جنم ہوتا ہے۔ اس طرح مارکس نے اپنے استاد کی پوری بات نہیں مانی۔ بلکہ اس کے بجائے فیورباخ کے نظریۂ مادیت کو قبول کر لیا۔ اُس نے ڈارون کے نظریۂ ارتقا کو لیا، روسو کے نظریۂ اجتماع کو لیا اور ہیگل کے نظریۂ جدلیت کو لے کر فلسفہ اشتراکیت تشکیل دیا۔ گویا کہ معاشی سیاسی افکار و خیالات کو مادی جدلیت (Dialectical Materialism) کی بنیاد پر آگے بڑھایا۔

اس اساس پر اُس نے کہا کہ جب صنعتی دور آیا اور سرمایہ داری نظام ایڈم سمتھ کے نظریات کے تحت بنا، تو یہ ایک Thesis تھا کہ سرمایہ دار کے پاس دولت کا ارتکاز ہونا شروع ہو گیا۔ اس کے مقابلے پر مزدوروں کی طاقتیں اُبھریں۔ یہاں واضح رہے کہ 1835ء میں پہلا کمیون امریکا میں بنا اور اس کے لیے ''کمیون'' کا لفظ استعمال کیا گیا۔ جرمنی کے کچھ گاؤں اور دیہاتوں میں بھی اسی اساس پر کمیونز کی شکل میں سرمایہ داری کا ردِعمل پیدا ہوا۔ مارکس نے تو کمیونزم (Communism) کا لفظ بعد میں استعمال کیا یعنی اشتراکی اور اجتماعی نظام۔ اُس نے کہا کہ اب یہ مزدور اور سرمایہ دار کے درمیان جو جدل ہوگا تو اس جدل کے نتیجے میں Synthesis یعنی اشتراکیت وجود میں آئے گی۔

www.rahimia.org

شاہ صاحب کی نظر میں وحدت انسانیت

اب آیئے! شاہ صاحبؒ کے فلسفہ معاشیات پرغور کیجئے کہ انہوں نے جب یہ بات کہی کہ "الرأی الکلی"، یعنی کل انسانیت کے مفاد کے تناظر میں بات ہونی چاہیے، معاشیات کی تاریخ میں بھی، دولت کی پیدائش، تقسیم، تبادلے اور صَرف میں بھی انسانی مفادِ عامہ کو پیشِ نظر رکھنا چاہیے۔ قرآن وسنت سے یہ بات واضح ہے کہ کل انسانیت مکرم اور معظم ہے۔ چناں چہ ارشادِ ربانی ہے:

وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيٓ اٰدَمَ وَحَمَلْنٰهُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَرَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ وَفَضَّلْنٰهُمْ عَلٰى كَثِيْرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيْلًا ۝ [13] (اور ہم نے آدم کی اولاد کو عزت دی ہے، اور خشکی اور دریا میں اُسے سوار کیا، اور ہم نے انھیں ستھری چیزوں سے رزق دیا، اور اپنی بہت سی مخلوقات پر انھیں فضیلت عطا کی۔)

شاہ صاحبؒ کا فلسفہ یہ ہے کہ انسانیت اپنی نوع کے اعتبار سے ایک ہے۔ انھوں نے وحدتِ انسانیت کا تصور (concept) دیا کہ تمام انسان اپنے نوعی تقاضوں اور جسمانی تقاضوں کے اعتبار سے برابر ہیں۔ مثلاً بھوک ہر ایک کو لگتی ہے۔ پیاس ہر ایک کو لگتی ہے۔ سردی گرمی سے بچاؤ ہر ایک کی ضرورت ہے، چاہے وہ کوئی انجینئر ہو، ڈاکٹر ہو، مزدور ہو، کسان ہو، پڑھا لکھا ہو، جاہل ہو۔ یعنی معاشی احتیاجات کی تسکین کی ضرورت ہر انسان کو ہے۔ اس طرح نوعی تقاضوں اور ان احتیاجات کے حوالے سے تمام انسان ایک وحدت میں پروئے ہوئے ہیں۔ انھوں نے انسانی مفاد کے لیے بنائے جانے والے تمام نظاموں میں انسانیت کو اصل قرار دیا ہے۔ پھر انسانوں کی اس وحدت سے اوپر کائنات بھی ایک وحدت لیے ہوئے ہے۔

شاہ صاحبؒ نے اپنے فلسفے میں کائنات میں وحدت پر بہت زور دیا ہے۔ شاہ صاحبؒ نے کہا کہ یہ کائنات مختلف اور متنوع ہونے کے باوجود ایک ''شخص'' ہے، جیسے یہ انسان شخصِ اصغر یا شخصِ صغیر ہے، ایسے ہی یہ پوری کائنات ایک ''شخصِ اکبر'' ہے۔ جیسے اس جسمِ انسانی میں ایک روح ''روحِ جزئی'' اور طبیعتِ انسانی پر مبنی ایک جسمِ انسانی ہے، ایسے ہی اس پورے شخصِ اکبر کی بھی ایک ''روحُ الکل'' اور ایک اس کا جسم الکل یا ''طبیعتُ الکل'' ہے۔ اس طرح وحدتِ کائنات ہے، یعنی اس میں تمام تر تنوعات کے باوجود ایک درجے کی وحدت ہے۔ کم از کم ''وحدت الوجود'' یعنی وجود کی وحدت ہے کہ تمام اشیا عرش سے لے کر فرش تک اپنا ایک وجود رکھتی ہیں۔ زمان و مکان وغیرہ آٹھ دس وہ اُمور جنھیں فلاسفہ نے ''اُمورِ عامہ'' کے طور پر متعین کیا ہے، اُن میں کائنات کی تمام اشیا ایک وحدت رکھتی ہیں۔ اس عالَم گیر وحدت کے ذیل میں ایک وحدت نوعِ انسانی کی بھی ہے۔ کائنات کی وحدت کا نظام تو اللہ تبارک وتعالیٰ کی ذات کے پاس ہے اور اس کا تکوینی نظام ہے۔ اُس کے لیے تو تقدیرات وضع کر دی گئیں۔ اس نوعِ انسانی کی وحدت کے لیے تشریعی نظام کو عملی طور پر قائم کرنے کی ذمہ داری اللہ تبارک وتعالیٰ نے ہم پر عائد کی ہے۔ اس طرح ہمارا مطمحِ نظر انسانوں کے لیے سیاسی، معاشی اور سماجی نظام بنانا ہے۔

پیدائش دولت میں شرکت کی اہمیت

نوعِ انسانیت کی ترقی کے لیے اللہ تعالیٰ نے شریعت مقرر کی ہے۔ اس کا ایک اہم ترین شعبہ معیشت ہے۔ معاشیات کی تعریف اور اُس کے فلسفے کے بعد اس کے بنیادی امور بھی متعین ہیں۔ شاہ صاحبؒ نے اس حقیقت کی نشان دہی بھی کی ہے کہ ہر انسان کو جو سوسائٹی میں موجود ہے، اُسے پیدائش دولت کے عمل میں شرکت کرنی ہے۔ لوگ معاشرے پر بوجھ نہیں ہونے چاہئیں۔

www.rahimia.org

انھیں مفت خور نہیں ہونا چاہیے۔ تمام لوگ کام کریں گے۔ اگر وہ کوئی کام کیے بغیر کوئی چیز لینا چاہتے ہیں تو شاہ صاحبؒ کے الفاظ میں ''**یصیرون کَلًّا علیٰ المدینة**'' [14] (وہ سوسائٹی پر بوجھ بن جاتے ہیں)۔

اس لیے پیدائشِ دولت کے عمل میں ہر انسان کو شریک ہونا ضروری ہے۔

شاہ صاحبؒ نے اس حوالے سے یہ بھی ارشاد فرمایا ہے کہ:

''**من فقه الرّجل أن ینظر إلیٰ حاجاته فلیختر کسباً یکفی لها.**'' [15] (انسان کی دانش اور شعور کا تقاضا ہے کہ وہ اپنی حاجات کا تعین کرے اور وہ ایسا پیشہ اختیار کرے، جو اُس کی تمام ضروریات کو کفایت کرنے والا ہو۔)

مثلاً اسے اپنا گھر چلانے، اپنی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے کتنے اور کس قدر وسائل کی ضرورت ہے۔ اُن وسائل کے مطابق اُسے کیا پیشہ اختیار کرنا ہے۔ شاہ صاحب نے پیشوں کے لیے ''اصول المکاسب'' (بنیادی پیشے) متعین کیے ہیں۔ اُن کے نزدیک تمام پیشوں کے بنیادی اساسی اصول تین ہی ہیں: (۱) زراعت، (۲) صنعت اور (۳) تجارت۔ اس سے پھوٹنے والے اس کے ذیلی شعبے ہیں۔ پھر ان تینوں شعبوں کو منظّم کرنے والا وہ ریاستی نظام، یا انتظامیہ جو داخلی سلامتی کے ادارے اور باہر کے حملہ آوروں سے بچانے کے لیے عسکری یا فوجی قوت کی صورت میں یا انتظامی نظم و نسق چلانے والوں کی صورت میں ہوتی ہے۔ شاہ صاحبؒ نے کہا کہ اس تناظر میں سوسائٹی میں دولت کی پیدائش کا عمل ہموار طریقے سے آگے بڑھنا چاہیے۔

انسان مدنی الطبع ہے

شاہ صاحبؒ کہتے ہیں کہ تمام انسان مدنی الطبع ہیں۔ اجتماعیت کی سوچ رکھتے ہیں۔ اس لیے لازماً تمام لوگوں میں، اللہ نے تعاونِ باہمی کو واجب اور لازمی قرار دیا ہے۔ معاشی شعبوں میں تعاونِ باہمی ہے تو وہ درست ہیں۔ اگر تعاونِ باہمی نہیں ہے، اختلاف و انتشار ہے، ہر آدمی دوسرے کو کہنی مار کر پیچھے گرانا چاہتا ہے اور خود آگے بڑھنا چاہتا ہے تو یہ بنیادی طور پر دولت کی پیدائش، تقسیم، تبادلے اور صَرف کے تمام اصولوں کے تناظر میں غلط ہے۔

پیدائش دولت کے عمل میں بھی سوائے مجنون و پاگل کے تمام لوگ شریک ہوں گے۔ اس حوالے سے حضور اکرمؐ کی ایک حدیث بھی ہے کہ کسی کو کسی پر بوجھ نہیں بننا چاہیے۔ ایک اَور روایت میں ہے کہ ایک آدمی نبی اکرمؐ کے سامنے سے گزرا۔ رسول اللہؐ کے صحابہؓ نے اُس کی محنت کشی کی طاقت وقوت اور جسمانی نشاط کو دیکھا تو انھوں نے حضورؐ سے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! کاش یہ نوجوان اللہ کے راستے میں ہوتا۔ تو رسول اللہؐ نے ارشاد فرمایا:

''**إن کان خرج یسعیٰ علیٰ ولدہٖ صغاراً فھو فی سبیل اللّٰه، و إن کان خرج یسعیٰ علیٰ أبوین شیخین کبیرین فھو فی سبیل اللّٰه، فإن کان خرج یسعیٰ علیٰ نفسہٖ یعفّھا فھو فی سبیل اللّٰه، و إن کان خرج ریاءً و مفاخرةً فھو فی سبیل الشّیطان.**'' [16]

(اگر یہ اپنے چھوٹے بچوں کی پرورش کے لیے محنت و مشقت کرنے کے لیے نکلا ہے تو یہ اللہ کے راستے میں ہے۔ اگر یہ اپنے دو بوڑھے والدین کے لیے کمانے نکلا ہے تو یہ اللہ کے راستے میں ہے۔ اور اگر یہ اپنی عفتِ نفس کے لیے کمانے نکلا ہے تو اللہ کے راستے میں ہے۔ اور اگر لوگوں کو دکھانے اور مال پر فخر کرنے کے لیے نکلا ہے تو پھر

www.rahimia.org

شیطان کے راستے میں ہے۔)

اسی طرح ایک موقع پر کچھ لوگ حضورؐ کے پاس آئے اور انھوں نے ایک آدمی کی نیکی کا تذکرہ کیا۔ انھوں نے بتلایا کہ:

''**یا رسول اللّٰہ! خرج معنا حاجّاً، فإذا نزلنا منزلاً لم یزل یصلّی، حتّٰی نرحل. فإذا ارتحلنا لم یزل یذکر اللّٰہ عزّ و جلّ حتّٰی ننزل، فقال** ﷺ: **فمن کان یکفیہ علف ناقتہٖ و صنع طعامہٖ؟ قالوا: کُلُّنا یا رسول اللّٰہ! قال: ''کُلُّکم خیر منہٗ.''** [17] (اے اللہ کے رسول! وہ آدمی ہمارے ساتھ حج کرنے کے لیے نکلا۔ پس جب ہم کسی جگہ پڑاؤ کے لیے اُترتے تو وہ نماز میں مشغول ہوجاتا، یہاں تک کہ ہم وہاں سے کوچ کرتے۔ جب ہم سواریوں پر سوار ہوتے تو وہ اللہ عز وجل کے ذکر میں مشغول رہتا، یہاں تک کہ ہم کسی جگہ پڑاؤ کرتے۔ آپؐ نے دریافت فرمایا کہ: ''اس کی اونٹنی کو چارہ کون ڈالتا تھا اور اُس کا کھانا کون تیار کرتا تھا؟ تو انھوں نے کہا کہ یارسول اللہ! ہم سب یہ کام کرتے تھے۔ تو آپؐ نے فرمایا: ''تم سب اُس سے بہتر ہو۔'')

پھر شاہ صاحبؒ نے کہا کہ پیدائش دولت کے عمل میں جب بھی کوئی عمل شروع کیا جائے تو ہر پیشے میں کام کرنے والے کو اپنے اندر یہ مہارت اور صلاحیت پیدا کرنی ہے کہ سب سے پہلے اُس پیشے کے جو بنیادی ارکان ہیں یا بنیادی ڈھانچہ ہے، اُسے پورا کرے جب کہ اس کی تزئین و آرائش پر پیسہ بعد میں خرچ کرنا چاہیے۔ سب سے پہلے پیشے کی بنیاد پر پیدائش کا عمل، سوسائٹی کی ترقی کے لیے ہونا چاہیے، محض ذاتی مفاد سے نہیں۔ [18] رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''**التّاجر الصّدوق الأمین مع النّبیّین و الصّدّیقین و الشہداء.**'' [19]

(سچا امانت دار تاجر قیامت کے روز انبیاؑ اور صدیقین اور شہداء کے ساتھ ہوگا۔)

اس لیے کہ تجارت کا مقصد پیسہ بٹورنا نہیں ہوتا۔ تجارت کا مقصد انسانی احتیاجات کی تسکین کے لیے انسانوں کو اُن کے مقام پر اشیا مہیا کرنا اور اُن کی خدمت سرانجام دینا ہوتا ہے۔

پیدائشِ دولت کی حقیقت

پیدائش دولت کیا ہوتی ہے؟ یہ درحقیقت کسی چیز میں ''افادیت'' (Utility) پیدا کرنا ہے۔ معاشیات میں یہ افادیت کئی طرح سے بیان کی جاتی ہے:

1۔ پہلا: افادۂ شکل (Utility of Form): آپ نے پیدا شدہ قدرتی مادے کے اندر ایک نئی شکل پیدا کردی۔ مثلاً درخت کی لکڑی جنگل سے کاٹ کر لائے اور اس کا فرنیچر بنا دیا تو لکڑی کو نئی شکل وصورت دے دی۔ ایک ضرورت کو پورا کرنے کے لیے آپ نے ایک عملِ تخلیق کیا۔ اسی کو پیدائشِ دولت کا عمل کہتے ہیں۔

2۔ دوسرا: افادۂ مقام (Utility of Place) ہے۔ کسی چیز کو ایک جگہ سے اٹھا کر آپ کسی دوسرے شہر لے گئے، تاکہ اس چیز تک انسانوں کی رسائی ہوجائے۔ اسے تجارت کے حوالے سے ایک مفید سرگرمی کہا جاتا ہے۔

3۔ تیسرا: افادۂ حفاظت (Utility of Possession) ہے۔ ایک شئے کو خاص وقت تک آپ نے محفوظ رکھا اور آپ کی اس پر محنت صَرف ہوئی۔ اس طرح اس شئے میں افادیت پیدا ہوگئی۔ مثلاً ایک کاشت کار فصل کاشت اور اس کی حفاظت کرتا ہے،

www.rahimia.org

اس کا مادے کی نشو ونما میں ذاتی طور پر کوئی کردار نہیں ہوتا۔ اس طرح ابتدائی طور پر یہ افادہ شعبۂ زراعت کے ذریعے کیا جاتا ہے۔ ثانوی طور پر مصنوعات اور تجارتی اشیا کے تحفظ کے لیے ہونے والی محنت سے پیدا ہونے والا افادہ ہے، جسے افادہ وقت (Utility of Time) بھی کہا جاتا ہے۔

پیدائش دولت کا یہ عمل اور اپنی محنت کے ذریعے سے چیزوں میں یہ افادیت پیدا کرنا خود اپنی ضروریات پوری کرنے اور دیگر انسانوں کی ضروریات کی تکمیل کی نیت سے ہونا چاہیے۔ یوں پورے سماج کے لیے افادیت پیدا ہوتی ہے۔ کسی شئے میں حقیقی افادیت پیدا کرنے کی صورت میں ہی اس کا ایک معقول معاوضہ یا منافع آپ لینے کے حق دار ہوتے ہیں۔ اس کا پورا طریقۂ کار شاہ صاحبؒ نے وضع کیا ہے۔

تبادلہ دولت کا اصول

اسی طریقے سے خرید وفروخت پر مبنی جتنی بھی احادیث ہیں، شاہ صاحبؒ نے ان کا ایک خلاصہ بیان کیا۔ اور بتلایا کہ یہ تبادلہ دولت کا عمل اعلیٰ انسانی اصولوں پر، تعاونِ باہمی کی بنیاد پر ہونا چاہیے۔لہٰذا ہر وہ بیع باطل اور فاسد ہے، جو کسی بھی ایک فریق کو نقصان پہنچائے۔ ہم حدیث اور فقہ کی کتابوں میں ''کتاب البیوع'' میں پڑھتے ہیں کہ تبادلہ اشیا میں چار چیزیں ہوتی ہیں:

(۱) بائع (بیچنے والا) (۲) مشتری (خریدنے والا)

(۳) ثمن (دونوں کے درمیان طے شدہ رقم) (۴) مبیع (فروخت کی گئی شئے)

عقدِ بیع کرتے ہوئے بائع اور مشتری کی حیثیت اور ثمن اور مبیع کی نوعیت برابر ہونی چاہیے۔ اگر برابر نہیں ہے، کسی ایک کا مفاد زیادہ ہے یا کسی ایک کے مفاد پر مبنی کوئی بھی شرط لگا دی جائے تو بیع باطل اور فاسد ہوجاتی ہے۔ اسی طریقے سے ثمن (قیمت) اور مبیع (فروخت شدہ چیز) بھی دونوں ہم مثل ہوں اور ان میں مماثلت ہونی چاہیے۔ اگر اُونچ نیچ ہوگی اور کمی زیادتی ہوگی تو وہ بھی بیع فاسد ہوگی۔ گویا عقد باطل ہوجاتا ہے۔ دونوں متبادل اشیا کے کم یا زیادہ ہونے سے، یا بائع اور مشتری میں سے کسی ایک کے ظلم کے نتیجے میں۔

تقسیمِ دولت کی حکمت عملی

تقسیمِ دولت کا قانون بھی دینِ اسلام میں انسانی اجتماعی مفاد کو سامنے رکھ کر مقرر کیا گیا ہے۔ یہی وہ قانون اور ضابطہ ہے، جسے حضرت ابوبکر صدیقؓ نے جاری کیا۔ انھوں نے اپنے عہدِ خلافت میں بیت المال سے مال کی تقسیم کے وقت تمام لوگوں کو برابر اور مساوی طور پر اموال دیے۔ ان اموال کی تقسیم کے اعداد و شمار یہ ہیں کہ ایک بار 7.1/3 درہم اور دوسری بار 20 درہم سب کو ملے۔ چناں چہ ''كتاب الخراج'' میں قاضی ابو یوسفؒ نے حضرت ابوبکر صدیقؓ کے دورِ خلافت کے بارے میں لکھا ہے:

''و بقيت بقيّة من المال، فقسّمها بين النّاس بالسّوية علٰى الصّغير و الكبير، و الحُرّ و المملوک، و الذّكر و الأُنثٰى، فخرج علٰى سبعة دراهم و ثلث لكلّ إنسان. فلمّا كان العام المقبل، جاء مال كثير هو أكثر من ذٰلک، فقسّمهٗ بين النّاس، فأصاب كُلّ إنسان عشرين درهماً.'' [20] (حضرت ابوبکر صدیقؓ نے بیت المال کے بقیہ مال کو لوگوں کے درمیان مساوی طور پر تقسیم کردیا۔ ہر

www.rahimia.org

ایک چھوٹے اور بڑے، آزاد اور غلام، عورت اور مرد کو سات درہم اور ایک درہم کا تہائی حصہ مساوی طور پر ہر انسان کو دیا۔ جب دوسرا سال آیا اور پہلے سے زیادہ مال بیت المال میں آیا تو حضرت ابوبکر صدیقؓ نے اُسے بھی لوگوں کے درمیان اسی اصول پر تقسیم کیا۔ چناں چہ ہر انسان کو بیس درہم مساوی طور پر ملے۔)

اس پر کچھ لوگ حضرت ابوبکر صدیقؓ کے پاس آئے اور انھوں نے کہا کہ:

''یا خلیفة رسول اللّٰه! إنک قسّمت هٰذا المال فسوّیت بین النّاس، و من النّاس اُناس لهم فضل و سوابق و قدم، فلو فضّلت أهل السّوابق و القدم و الفضل بفضلهم.'' [21]

(اے رسول اللہؐ کے خلیفہ! آپ نے یہ مال لوگوں کے درمیان مساوی طور پر تقسیم کیا ہے، حال آں کہ کچھ لوگ ایسے ہیں، جن کی قدیم خدمات ہیں، دینی کاموں میں سبقت لے جانے والے ہیں اور فضیلت رکھنے والے ہیں۔ کاش کہ آپ ان لوگوں کو کچھ زیادہ عنایت فرماتے۔)

چناں چہ صحابہؓ میں سے ایسے صحابی بھی ہیں، جنھوں نے بدر میں خدمات سرانجام دیں۔ بدر سے لے کر اب تک اُن کی محنتیں ہیں اور کچھ وہ لوگ ہیں، جو فتح مکہ کے موقع پر مسلمان ہوئے۔ کچھ لوگ ہیں، جو ابھی مسلمان ہوئے۔ آپ نے سب کو برابر کر دیا۔ قاضی ابویوسف نے حضرت ابوبکر صدیقؓ کا یہ جواب نقل کیا ہے۔ انھوں نے ارشاد فرمایا:

''أمّا ذکرتم من السّوابق و القدم و الفضل، فما أعرفنی بذٰلک، و إنّما ذٰلک شیء ثوابهٗ علی اللّٰه جلّ ثنائهٗ، و هٰذا معاش فالاُسوة فیه خیر من الاُثرة.'' [22] (یہ جو تم نے سبقت لے جانے والے قدیم اور صاحبِ مرتبہ لوگوں کا ذکر کیا ہے، یہ ایسا ہے کہ میں تم سے زیادہ جانتا ہوں۔ یہ ایک ایسا کام ہے، جس کا ثواب اللہ جل شانہٗ پر ہے۔ یہ معاشیات کا معاملہ ہے۔ اس میں ایک کو دوسرے پر ترجیح دینے سے مساوات بہتر ہے۔)

صاحبِ فضل و احسان کے کاموں کا اس دنیا میں اس کا کوئی معاوضہ نہیں ہے کہ غزوۂ بدر میں زیادہ خدمات سرانجام دیں۔ گویا مطالبہ کرنے والوں نے یہ مطالبہ نہیں کیا تھا کہ مال داروں کو مزید ملنا چاہیے اور غریبوں کو کم ملنا چاہیے۔ بلکہ اُن کا مطالبہ یہ تھا کہ جنھوں نے غلبہ دین کے لیے خدمات زیادہ انجام دی ہیں، اُن کی حوصلہ افزائی کے لیے اُن کو کچھ زیادہ ملنا چاہیے۔ تو حضرت ابوبکر صدیقؓ نے کہا کہ یہ معاشیات کا معاملہ ہے، اس میں معاشی مساوات کے قانون پر عمل ہوگا۔

حضرت عمر فاروقؓ کا دور آیا تو انھوں نے اسلام کے لیے زیادہ خدمات سرانجام دینے والوں کو ترجیح دی اور انھیں بیت المال سے زیادہ مال عطا کیا، لیکن آخری زمانے میں انھوں نے بھی معاشی مساوات کے قانون پر عمل کرنے کا عزم اور ارادہ ظاہر کیا۔ چناں چہ قاضی ابویوسفؒ لکھتے ہیں:

''و لمّا رأی المال قد کثر، قال: ''لئن عشت إلٰی هٰذه اللّیلة من قابل، لاُلحقن اُخری النّاس بأولٰهم حتّٰی یکونوا فی العطاء سواء.'' [23] (جب حضرت عمرؓ نے مال کی کثرت کو دیکھا تو ارشاد فرمایا کہ: ''اگر میں آئندہ سال آج کے دن تک زندہ رہا تو میں ضرور پیچھے رہ جانے والے لوگوں کو پہلوں کے ساتھ شامل کر دوں گا، یہاں تک کہ تمام لوگ بیت المال کی عطا حاصل کرنے میں مساوی ہو جائیں۔)

www.rahimia.org

صرفِ دولت کا اصول

معاشروں میں صرف دولت اور اخراجات کے حوالے سے دو طریقے پائے جاتے ہیں:

1۔ اسراف اور تبذیر (ضرورت سے زائد فضول خرچ کرنا)

2۔ اس کے مقابلے میں تقتیر اور بخل (مال کی محبت میں ضرورت سے کم مال خرچ کرنا)

قرآن حکیم کا حکم ان دونوں سے ہٹ کر یہ ہے:

وَالَّذِيْنَ اِذَآ اَنْفَقُوْا لَمْ يُسْرِفُوْا وَلَمْ يَقْتُرُوْا وَكَانَ بَيْنَ ذٰلِكَ قَوَامًا ﴿٦٧﴾ [24] (اور وہ لوگ جب خرچ کرتے ہیں تو فضول خرچی نہیں کرتے، اور نہ تنگی کرتے ہیں، اور ان کا خرچ ان دونوں کے درمیان اعتدال پر ہوتا ہے۔)

یوں قرآن حکیم نے صرفِ دولت کے حوالے سے درمیانہ درجہ متعین کیا ہے۔ اِسراف یہ ہے کہ مثلاً کوئی ضرورت دس روپے خرچ کرنے سے پوری ہوتی ہے۔ وہاں پر بیس خرچ کردیے جائیں۔ بخل اور تقتیر یہ ہے کہ ضرورت دس روپے خرچ کرنے کی ہے اور وہاں پانچ روپے خرچ کیے جائیں۔

اس طرح قرآن حکیم اور حدیث کی تعلیمات کی روشنی میں شاہ صاحبؒ نے معاشی نظام کے حوالے سے پیدائشِ دولت، تقسیمِ دولت، تبادلۂ دولت اور صرفِ دولت سے متعلق ایک جامع اور مکمل معاشی نظام واضح کیا ہے۔

فاسد معاشی نظام اور اُس کی خرابیوں کی نوعیت

یہ بھی ضروری امر ہے کہ معاشی سسٹم کا تعلق کسی ریاست اور مملکت کے نظام کے ساتھ جڑا ہوتا ہے۔ اس پر حضرت امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے بڑا بہترین تجزیہ کیا ہے اور اپنے زمانے میں معاشی خرابیوں کے بنیادی اسباب بیان کرتے ہوئے لکھا ہے:

''و غالب سبب خراب البُلدان فی هذا الزّمان شيئان:

أحدهما: تضييقهم علىٰ بيت المال، بأن يعتادوا التّكسّب بالأخذ منهم علىٰ أنّهم من الغُزاة، أو من العُلماء الّذين لهم حقّ فيه، أو من الّذين جرت عادت الملوك بصلتهم، كالزّهّاد والشّعراء، أو بوجه من وجوه التّكدّي، و يكون العمدة عندهم هو التّكسّب، دون القيام بالمصلحة، فيدخل قوم علىٰ قوم فينغصون عليهم، و يصيرون كَلًّا علىٰ المدينة.

و الثّاني: ضرب الضّرائب الثّقيلة علٰى الزُّرّاع، و التُّجّار، و المتحرّفة، و التّشديد عليهم، حتّٰى يفضي إلٰى إجحاف المطاوعين و استئصا لهم، و إلٰى تمنّع أولي باس شديد و بغيهم.'' [25]

(اس زمانہ میں ملکوں کی خرابی کے دو بنیادی اسباب ہیں:

ایک بڑا سبب یہ ہے کہ لوگوں نے قومی خزانے کو مختلف حیلوں بہانوں کے ذریعے لوٹنا شروع کردیا ہے، اور اس ذاتی مفاد پرستی پر مبنی لوٹ کھسوٹ کو ہی اپنی کمائی کا دھندہ بنالیا ہے۔ کچھ لوگ ہیں جو غازی اور مجاہد بن کر اسے لوٹ رہے ہیں۔ بعض علما ہیں جو اپنے تئیں علم کی وَجہ سے قومی خزانے کا مستحق سمجھتے ہیں۔ کچھ ایسے ہیں جو حکمران طبقات سے بخشش اور انعام و اِکرام کے طلب گار رہتے ہیں، جیسے نام نہاد صوفی، شاعر اور ادیب لوگ ہیں۔ اور باقی لوگ بھی

www.rahimia.org

لوٹ کھسوٹ کے مختلف حیلوں بہانوں سے قومی خزانے کو حاصل کرنے کے لیے سرگرداں رہتے ہیں۔ان میں ذاتی مفادات اتنے غالب آ چکے ہیں کہ انھوں نے اسی لوٹ کھسوٹ کو اپنی کمائی کا پیشہ بنایا ہوا ہے۔ اور وہ اسے قومی اور اجتماعی مصلحتوں سے قطع نظر بہت اچھا کام سمجھتے ہیں۔

ذاتی مفاد پرستی کا عالم یہ ہوگیا ہے کہ ایک گروہ دوسرے گروہ پر حملہ آور ہوتا ہے اور پھر وہ ایک دوسرے کے لیے تنگی کا باعث بنتے ہیں۔ یہ تمام لوگ سوسائٹی اور ملک پر بوجھ بن چکے ہیں۔

دوسرا بڑا سبب یہ ہے کہ کاشت کاروں، تاجروں اور ہنر مندوں (professionals) یعنی پیداواری جماعتوں پر بھاری ٹیکسز عائد کر دیے جاتے ہیں اوران کی وصولی کے لیے ان پر تشدد کیا جاتا ہے، یہاں تک کہ صورتِ حال یہ بن جاتی ہے کہ قانون کی پاس داری کرنے والوں کے حقوق بغیر کسی شنوائی کے سلب کر لیے جاتے ہیں اوران کو تباہ و برباد کر دیا جاتا ہے اور طاقتور گروہ محاذ آرائی اور سرکشی پر اتر آتے ہیں)

شاہ صاحبؒ نے واضح کیا کہ بیت المال پر تمام لوگوں کا جھپٹنا، اس کے وسائل کو لوٹنا اور اس لوٹ کھسوٹ میں تمام تر افراد کا شامل ہونا معاشی عدمِ استحکام کا سبب بنتا ہے۔ شاہ صاحبؒ نے لکھا کہ جو فوجی اور اُمرا ہیں، وہ اس لیے ملکی خزانہ لوٹتے ہیں کہ ہم نے ملک کی خدمت سرانجام دی ہے، ہمیں زیادہ سے زیادہ مال ملنا چاہیے۔ علما ہیں تو وہ کہتے ہیں کہ ہم تعلیم دے رہے ہیں، اس لیے ہمیں زیادہ سے زیادہ بیت المال سے پیسے ملنے چاہئیں۔ شعرا اور اُدبا ہیں، وہ اس بیت المال پر جھپٹنا چاہتے ہیں۔ ان کی نظریں اس پر ہیں۔ وعظ گو ہیں تو وہ اپنے وعظ کا وظیفہ بھی خلیفہ اور حکومت سے لینا چاہتے ہیں۔ شاہ صاحبؒ نے کہا کہ اور تو اَور وہ فقرا اور زہاد یا صوفیا جو زہد و تقویٰ کی زندگی بسر کرنے کے دعوے دار ہیں، وہ بھی چاہتے ہیں کہ اس کا معاوضہ ہمیں حکومت سے ملے۔ شاہ صاحبؒ کہتے ہیں کہ عجیب بات ہے کہ جو بیت المال ہے، وہ تو قومی نظام چلانے کے لیے، ملکی نظم و نسق کی عمومی اسلامی مصلحت کی بنیاد پر قائم کیا گیا ہے یا یہ کہ یہ اُجاڑنے کی جگہ ہے کہ ہر آدمی اُس پر بوجھ بن جائے۔

شاہ صاحبؒ نے آخر میں یہ اہم جملہ ارشاد فرمایا ہے کہ: ''یہ سب کے سب اس سوسائٹی پر بوجھ بن چکے ہیں۔'' اور پھر اس چھینا جھپٹی میں ہر ہر طبقے کا جہاں داؤ لگتا ہے تو وہ اس داؤ کے نتیجے میں آپس میں لڑ پڑتے ہیں، ایک دوسرے پر فتوے لگاتے ہیں، کافر بناتے ہیں، مال و دولت کی لڑائی جھگڑے کے سبب ایک دوسرے کی عزتیں اُچھالتے ہیں، یہاں تک کہ سب ہی لوگ حکومت کے سامنے دریوزہ گر اور بھیک مانگنے والے بن گئے۔ ایک جملہ حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا ہے کہ ان کے نزدیک عمدہ ترین بات یہ ہے کہ کسی نہ کسی طریقے سے حکومت سے مال لوٹا جائے۔ ملک کی اصلاح اور سوسائٹی کی ترقی کا نظام قائم کرنا ان کا مقصد اور ہدف نہیں ہے۔ یہی ان کا تکسُّب اور پیشہ ہے۔

طبقاتی معاشی نظام کی خرابیاں شاہ صاحبؒ کی نظر میں

شاہ صاحبؒ کے نقطۂ نظر سے اس طرح معاشرے میں طبقاتی نظام وجود میں آجاتا ہے۔ جن کا جہاں ہاتھ پڑتا ہے اور طاقت ور ہیں وہ تو حکومت کے خزانے یا قومی وسائل کی لوٹ کھسوٹ پر سب سے آگے ہیں اور اس طرح امیر سے امیر تر بنتے جا رہے ہیں۔ جس بے چارے کا ہاتھ نہیں پڑتا، وہ غریب اور غریب سے غریب تر ہوتا چلا گیا۔

www.rahimia.org

اسی طرح شاہ صاحبؒ قیصر وکسریٰ کے حالات کا تذکرہ کرتے ہوئے اپنے دور کے حکمرانوں کے بارے میں لکھتے ہیں:

''و ما تراه من ملوک بلادک يغنيک عن حکاياتهم، فدخل كلّ ذٰلک فی أصول معاشهم، و صار لا يخرج من قلوبهم إلاَّ أن تمزّع و تولّد من ذٰلک داء عضال، دخل فی جميع أعضاء المدينة.'' [26] (یعنی عصر حاضر کے ملوک وسلاطین اور والیانِ ریاست کی عیاشیوں کو دیکھ کر تم ان (قیصر وکسریٰ) کی عیاشیوں اور زندگی کی لذات میں حد سے بڑھنے کا اندازہ لگاسکتے ہو، سرمایہ پرستی کے یہ تمام امراض ان کے اصولِ معاشیات میں داخل ہوجاتے ہیں۔ لوٹ کھسوٹ کا یہ طریقہ ان کے رَگ وپے میں سرایت کرجاتا ہے۔ جس کی وَجہ سے پورے تمدن اور معاشرے میں موجود تمام جماعتوں (communities) میں ایک لا علاج رَوگ پیدا ہوجاتا ہے۔)

شاہ صاحبؒ نے کہا کہ کسی قوم میں اگر سبھی لوگ وسائل کو لوٹنے لگ جائیں تو اتنے وسائل کہاں سے آئیں گے؟ اس کے نتیجے میں ایک دوسری خرابی یہ ہوتی ہے کہ جو کاشت کار، صنعت کار، یا تاجر ہیں، ان کام کرنے والوں پر ظالمانہ ٹیکس لگائے جاتے ہیں۔ جب یہ ظالمانہ ٹیکس ادا نہیں کرسکتے تو وہ مجبور ہوکر دو راستے اپناتے ہیں: یا تو وہ ردِّعمل میں تشدد پسند بنتے ہیں۔ پھر حکمران طبقہ اُن کے قتل کے درپے ہوتا ہے۔ یا مجبوراً وہ ٹیکس دیتے ہیں تو اُن کی کارکردگی پر فرق پڑتا ہے اور وہ غریب سے غریب تر بنتے چلے جاتے ہیں۔ اس طرح قومی ریونیو (revenue) مسلسل گھٹنا شروع ہوجاتا ہے۔ شاہ صاحبؒ نے اپنی کتابوں میں کئی مقامات پر اس کا واضح نقشہ کھینچا ہے۔ ایک جگہ شاہ صاحبؒ بتاتے ہیں:

''عیاشانہ زندگی بسر کرنے کے لیے ساز و سامان کا حصول ایک خطیر دولت خرچ کیے بغیر ناممکن ہوتا ہے جس کے لئے محنت کش طبقات یعنی کسانوں اور تاجروں وغیرہ پر بھاری ٹیکس لگا کر ان کی زندگی اجیرن کردی جاتی ہے۔ اگر وہ ٹیکس دینے سے انکار کردیں تو ان کو مارا پیٹا جاتا اور سخت سزائیں دی جاتی ہیں اور اگر سرمایہ داروں کی اطاعت بجالائیں تو ایسے بیلوں اور گدھوں کی سی ذلیل زندگی بسر کرتے ہیں۔ جن سے ان کی مرضی کے بغیر ہل چلانے، زمین کی کاشت، پیداوار اٹھانے اور کنویں سے پانی نکالنے کا کام لیا جاتا ہے۔ جن کی تھوڑی بہت پرورش یا غور و پرداخت صرف اس لیے کی جاتی ہے کہ مالکوں کی اپنے اغراض ان کے ساتھ وابستہ ہوتی ہیں۔'' [27]

اس معاشی بدحالی کا ایک بنیادی حل

شاہ صاحبؒ اس معاشی بدحالی کا ایک بنیادی حل تجویز کرتے ہیں اور کسی مملکت کے نظام کو درست کرنے کے لیے لازمی طور پر اس حقیقت کی نشان دہی کرتے ہیں:

''و إنّما تصلح المدينة بالجباية اليسيرة، و إقامة الحفظة بقدر الضّرورة، فليتنبّه أهل الزّمان لهٰذه النّكتة.'' [28] (کسی مملکت کا نظام بہتر طور پر ترقی تبھی کرتا ہے، جب لوگوں پر کم سے کم ٹیکس لگائے جائیں اور بہ قدرِ ضرورت انتظامیہ مقرر کی جائے۔ اس زمانے کے لوگوں کو یہ نکتہ پیش نظر رکھنا چاہیے۔)

شاہ صاحبؒ نے پہلی بات تو یہ بتلائی کہ سوسائٹی کی ترقی اس میں ہے کہ کم سے کم ٹیکس اور آسان ٹیکس عائد ہوں اور سوسائٹی کی سب سے زیادہ ترقی جو اصلاً پیداوار کرنے والے لوگ ہیں، اُن کی حقیقی تجارت زراعت اور صنعت سے ہوگی۔ شاہ صاحبؒ

www.rahimia.org

نے دوسری بات یہ کہی کہ حکمرانی کے نظام میں انتظامی افسران اور ذمہ داران بہ قدرِ ضرورت ہوں، یعنی جتنی سوسائٹی کو ضرورت ہے۔ یہ نہ ہو کہ وزیروں ومشیروں کی فوج ظفرموج ہو۔ سول انتظامیہ اور فوج بلاوجہ کی بھرتی ہو اور داخلی سیکیورٹی فورسز کے لیے لوگ اپنے رشتے داروں اور خاندانوں سے بھرتی کرلیے جائیں۔ الغرض جس ریاست کا معاشی نظام خراب ہوتا ہے، اس کی وجہ یہی ہوتی ہے کہ بیت المال یا قومی دولت پر مفت خورے مسلط ہوجاتے ہیں اور ٹیکسوں کا ظالمانہ نظام ہوتا ہے۔

فاسد معاشی نظام کا علاج

معاشی بدحالی کے علاج کے طور پر شاہ صاحبؒ نے آخری بات جو بیان فرمائی کہ جب کسی سوسائٹی پر ایسا مرض مسلط ہوجائے تو وہ نظام توڑے بغیر مسئلہ حل نہیں ہوتا، یعنی ''فَکُّ کُلِّ نِظَام'' (ہر فرسودہ اور ظالمانہ نظام کو توڑنا) اور اُس پر حضور ﷺ کی سنت کا تذکرہ کیا کہ قیصر و کسریٰ کے زمانے میں بھی یہی حالت تھی تو نبی اکرمؐ کے قلب میں یہ بات ڈالی گئی کہ اس طرح کی خرابیوں کو دور کرنے کے لیے ایسے سسٹم کا مادہ ہی سرے سے ختم کردیا جائے۔ قرآن حکیم میں ارشاد ہے:

فَقُطِعَ دَابِرُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا [29] (پھر اُن ظالموں کی جڑ کاٹ دی)

شاہ صاحبؒ نے واضح طور پر اس کی تعیین کی کہ معاشی سسٹم میں ''رائ جزئی''، یعنی انفرادی مفادات پر مبنی سرمایہ داری نظام کی اساس پر جو عمل بھی کیا جائے گا، وہ سوسائٹی کے لیے عذاب کا باعث ہے۔ اُس عذاب کو دور کرنے کے لیے مسلمان جماعت پر لازمی ہے کہ اُس پورے سسٹم کو توڑے۔ شاہ صاحبؒ نے ہر ایسے غلط معاہدۂ عمرانی کو توڑنے کے لیے یہ ارشاد فرمایا ہے:

''أنّ القضية لا محالة إمّا ربط منزليّ، أو مبادلة أو معاونة، فإذا فسد باب التّفتيش و التّحقيق فالحكم فكُّ الرّبط، و بقاء كل رجل على ما كان عليه. فإن كان هناک عدوان لأحد على الآخر فقدر العدوان قدر عدل لا وكس و لا رفع.'' [30] (انسانی معاشرے کا ہر قضیہ لامحالہ یا تو گھریلو معاہدے پر مشتمل ہوگا یا تبادلہ اشیا اور تعاونِ باہمی کا کوئی معاہدہ ہوگا۔ جب صحیح تفتیش و تحقیق میں فساد پیدا ہوجائے تو اُس کا حکم اُس معاہدے کو توڑ دینا ہے۔ اور ہر آدمی کو اپنی اصل حالت میں بقا کا حق ہے۔ اور اگر وہاں کسی ایک نے دوسرے پر ظلم اور زیادتی کی ہے تو اسی قدر عدل وانصاف کا نظام قائم کرنے کی ضرورت ہے۔ اس میں کوئی کمی کوتاہی نہ کی جائے۔)

حقیقت یہ ہے کہ ریاست قائم کرنے کی وجہ یہ ہے کہ ہر ایک سوسائٹی میں موجود معاہدات خواہ وہ گھر کے نظام سے متعلق ہوں، یا قومی اور شہری نظام اور بین الاقوامی ڈھانچے سے متعلق ہوں، ان کا مقصد ہر ایک سطح پر سوسائٹی کی ضروریات پوری کرنا ہوتا ہے۔ اگر کوئی بھی معاہدہ ضرورت پوری نہ کررہا ہو تو حکم یہ ہے کہ اس کو توڑ دیا جائے۔ چناں چہ میاں بیوی کی مثال دے کر کہا ہے کہ اگر دونوں جس سماجی ضرورت کی تکمیل کے لیے ایک چھت تلے جمع ہوئے ہیں، وہ پوری نہیں ہوتی اور ایک دوسرے سے لڑائی جھگڑا انتہا تک پہنچ چکا ہے کہ اب اس کا کوئی حل نہیں تو حکم یہ ہے کہ اس تعلق کو توڑ دیا جائے۔ حتیٰ کہ مرد طلاق نہ دے رہا ہو تو قاضی کو بھی یہ اختیار منتقل ہوجاتا ہے کہ وہ حقیقی صورتِ حال کی بنیاد پر رشتہ توڑ دے۔ تاکہ مرد و عورت کہیں اور معاہدہ کرلیں۔ اسی طرح ریاست میں بھی اگر معاشی سسٹم پر قابض حکمران طبقے ایسے ہوں تو اُن کے ساتھ بھی ایسا ہی معاملہ کیا جائے گا۔

www.rahimia.org

دین کے معاشی نظام کو علمی طور پر سمجھنے کی ضرورت و اہمیت

آج صورتِ حال یہ ہے کہ ہم نے اس گزشتہ عرصے میں اسلام کی ان اعلیٰ تعلیمات کا معاشی نظام نہ تو علمی طور پر لوگوں کے سامنے پیش کیا اور نہ ہی اس کی اساس پر پڑھنے پڑھانے کا کوئی نظام فکر اور تصور ہمارے سامنے رہا ہے۔ آج ہماری یونیورسٹیاں اور کالجز سرمایہ دارانہ اکنامکس پڑھاتی ہیں۔ وہ ایڈم سمتھ اور مارکس وغیرہ کے تصورات پر معاشیات پڑھاتے ہیں۔ زیادہ سے زیادہ زور لگائیں گے تو اسلامی معیشت کے نام پر محض زکوٰۃ، صدقات، خیرات، اوقاف کا ذکر کیا جاتا ہے، ان تصورات کا اسلام کے علمی نظام سے کوئی تعلق نہیں کہ اُسے اسلامی معیشت کے نام پر پڑھایا جائے کہ اس میں نہ معاشیات کی تعریف، نہ کوئی تقابلی جائزہ، نہ پیدائش دولت، نہ صرفِ دولت کی علمی بحث، نہ عاملین پیدائش دولت پر کوئی گفتگو، نہ اس کے حوالے سے کوئی متفقہ تصورات ہماری سوسائٹی میں پڑھائے جاتے ہیں۔

گزشتہ دوسو سال غلامی کے زمانے میں ہماری سوسائٹی پر سرمایہ داری نظام مسلط رہا ہے۔ آج اعلانِ آزادی کے بعد ستر سال سے بھی وہی نظام قائم ہے۔ اسی کے نتیجے میں ملکی اور قومی اثاثہ جات کی نجکاری کا قانون، انفرادیت کی بنیاد پر سرمایہ پرستی اور کھلی منڈی کے نام پر عالمی سامراجی معیشت کا نظام قائم ہے۔ اسی طرح عالمی سطح پر دوسرے ملکوں کی منڈیوں پر قبضے کا سامراجی طور طریقہ جاری ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ ظلم کا نظام ہے، جس سے آج ہماری پوری سوسائٹی عذاب میں مبتلا ہے۔ مسلسل قرضوں کی معیشت کے سبب وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ہر بچہ پیدا ہوتے ہی مقروض ہوتا ہے۔

وَجہ یہ ہے کہ ہم نے دین اسلام اور بالخصوص جس جامعیت کے ساتھ امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے اسلام کا فکر و عمل پیش کیا تھا، اس کو نہ اہلِ علم نے اس طریقے سے پھیلایا اور نہ ہی اس کی اساس پر اپنی معیشت قائم کرنے کے لیے ہم نے کوئی حکمتِ عملی بنائی۔ اللہ سے دعا ہے کہ ہمیں دین اسلام کی ان معاشی تعلیمات کو درست تناظر میں سمجھنے اور اس کے مطابق حکمتِ عملی بنانے اور جدوجہد و کوشش کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین!

سوالات و جوابات

سوال: دنیا میں معاشی حوالے سے 1930ء، 1970ء، یا 2008ء کے بعد آنے والے بحرانوں (crisis) کا ذکر ہوتا ہے۔ ان کی ہم وجوہ ذکر کرتے اور ان کے حل کا بھی ذکر کرتے ہیں۔ کیا شاہ صاحبؒ کے نظریات اور اُن کی تعلیمات میں اس قسم کے کرائسز کا کوئی ذکر ہے؟ اور کیا شاہ صاحبؒ نے ان کا کوئی حل پیش کیا ہے؟

جواب: یہ بحران (crisis) سرمایہ داری نظام کے ہیں۔ 1930ء کا بحران ہو، جو سرمایہ داری کی وَجہ سے پیدا ہونے والے ''تجارتی چکر'' کی وَجہ سے ہوا۔ تجارتی چکر کے نتیجے میں پیداوار زیادہ ہوگئی، طلب اس کی موجود نہیں تھی۔ مصنوعی طلب اور رسد کی اساس پر قوتِ خرید لوگوں سے ختم ہوگئی۔ تو بحران کی کیفیت پیدا ہوئی۔ اس کے بعد 1970ء کی دہائی میں جو بحران پیدا ہوا، وہ بھی سرمایہ داری کا پیدا کردہ تھا۔ 2008ء میں بھی جو معاشی بحران پیدا ہوا، وہ بھی سرمایہ داری کا ہے۔ مارٹ گیج سسٹم (Mortgage System) کے نتیجے میں یہ بحران پیدا ہوا کہ جب ایک پلاٹ مثلاً ایک کروڑ کا تھا، آپ نے اس پر دس جگہ قرض دے دیا، مثلاً

www.rahimia.org

دس کروڑ کا قرضہ جاری کر دیا۔ ہر آدمی جب پیسہ مانگنے کے لیے آئے تو ظاہر ہے کہ پیسہ تو نہیں ہوگا، یہی سوال ہے کہ کیا ایک اثاثہ پر نو گنا زیادہ قرض دیا جاسکتا ہے؟ تو یہ بھی سرمایہ داری نظام کا چکر ہے۔

ولی اللّٰہی فکر کی اساس پر ان بحرانوں کا تجزیہ یہ ہے کہ یہ جو تجارتی چکر یا مصنوعی طلب و رسد کا عمل اس وَجہ سے پیدا ہوا کہ جب آپ نے انسانیت کو ایک طرف رکھ دیا اور خود ساختہ تصورات کے تحت صرف سرمائے کے پرافٹ اور ریٹرن کی بنیاد پر سرمائے کی بالادستی کا سلسلہ شروع کر دیا اور زر کی جو حقیقی نوعیت تھی، وہ ختم کر کے کرنسی نوٹ اور اب ڈیجیٹل نوٹ بھی آنے شروع ہوگئے، گویا مصنوعی عمل شروع کر دیا تو اس کے نتیجے میں یہ بحران پیدا ہوئے ہیں۔ جب تک حقیقی معیشت نہیں ہوگی تو اسی طرح کے تضادات اور بحرانات آتے رہیں گے۔

سوال: ہیگل کے نظریۂ ''روح الکل'' اور شاہ صاحبؒ کے نظریۂ ''روح الکل'' میں بنیادی طور پر کیا فرق ہے؟ لگتا تو ایسے ہے کہ وہ بھی مذہب کی طرف سے ہے اور یہ بھی مذہب کی بنیاد پر ہے؟

جواب: شاہ صاحبؒ کے نزدیک ''روح الکل'' کے ساتھ ''طبیعت الکل'' بھی ہے اور ''شخصِ اکبر'' کا مکمل تصور ہے۔ اس طرح اُن کے نزدیک کائنات ان تینوں کے مربوط دائرے کی صورت میں وجود پذیر ہوئی ہے اور اسی سے کائنات ایک کلی وحدت کی صورت رکھتی ہے۔ جب کہ ہیگل کی طرف سے تو صرف ''روح الکل'' کی بات سامنے آئی ہے۔ اور وہ ''طبیعتِ کلیہ'' کے تصور سے عاری ہو کر طبیعی اور مادی دنیا میں جدلیت کے تصورات رکھتا ہے۔ اس سے کائنات کی وحدتِ کلی کا تصور سامنے نہیں آتا۔

سوال: آج کے معاشی نظام میں بینکنگ کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ ہمارے ہاں اسلامی معاشیات کے حوالے سے کچھ لوگ کام کر رہے ہیں۔ اس کے حوالے سے یہاں پر کچھ ماڈل بھی موجود ہیں۔ اس کو شاہ صاحبؒ کے فلسفے کی روشنی میں ہم کیسے دیکھ سکتے ہیں؟

جواب: پہلی بات تو یہ سمجھنی چاہیے کہ بینکنگ پوری معیشت نہیں ہے۔ معاشی نظام کا ایک حصہ اور پورشن ہے۔ بینک کا بنیادی تصور تو یہ ہے کہ اس میں لوگوں کی چھوٹی چھوٹی بچتیں جمع ہوتی ہیں۔ اُن بچتوں کی بنیاد پر بینک تشکیلِ سرمایہ کا کام کرتے ہیں۔ بینک وہ جمع شدہ سرمایہ کسی سرمایہ دار کو استعمال کرنے کے لیے یا حکومت کو قرضوں کی شکل میں دیتا ہے۔ گویا کہ وہ تشکیلِ سرمایہ کی ایجنسی ہے، جو سرمائے کی فراہمی کے لیے سرمایہ داری نظام نے بنائی ہے۔ اس کا تعلق نہ براہِ راست پیدائشِ دولت سے ہے، نہ تقسیمِ دولت سے ہے، نہ تبادلۂ دولت سے ہے، اور نہ صرفِ دولت ہے۔ یہ اس کے ایک شعبے یعنی زر کو کنٹرول کرنے کے معاملے میں کام کرتی ہے۔ زر کی گردش اور مالیاتی پالیسی کے حوالے سے، بنیادی کام بھی سٹیٹ بینک کرتا ہے۔

اب اگر کسی ملک میں پیدائشِ دولت کیپٹل اِزم کے اصول پر ہو، تقسیمِ دولت، تبادلۂ دولت اور صَرفِ دولت سرمایہ دارانہ اصول پر ہو تو محض ایک ایجنسی، جو سرمائے کو منظّم (regulate) کرنے کی اتھارٹی ہے، اس کو اسلامی بنا لیا جائے یا غیر اسلامی رہے، کیا یہ بحث منطقی ہے؟ ہم سب کو معلوم ہے کہ یہ بینکوں کو اسلامی بنانے کے لیے جو تگ و دو شروع کی گئی تھی، یہ ضیاء الحق صاحب کے زمانے میں ہوئی۔ جب بینک اسلامی بنانے یا اسلامی معاشی نظام کو سامنے رکھ کر یہاں بات چلی تو دو کمیٹیاں بنائی گئیں: ایک ٹیکنیکل کمیٹی تھی، ماہرینِ معاشیات پر مشتمل۔ جس کے سربراہ اُس زمانے کے بیوروکریٹ غلام اسحاق خان تھے۔

www.rahimia.org

دوسری کمیٹی مولانا تقی عثمانی کی سربراہی میں علما کی بنائی گئی تھی کہ اسلام کا معاشی نظام یا بینکنگ سسٹم بنا کر دیں اور اُن سے کہا تھا کہ آپ اس کو عمل میں لانے کا جو ٹیکنیکل ڈھانچہ ہے وہ بیان کریں۔

دونوں رپورٹیں موجود ہیں۔ غلام اسحاق خان کی کمیٹی نے جو ٹیکنیکل کمیٹی تھی، اس رپورٹ کے مقدمے میں لکھا ہے کہ اگر آپ واقعی اسلامی معاشی نظام بنانا چاہتے ہیں تو اس کے لیے آپ کو ملک کا پورا معاشی ڈھانچہ بدلنا پڑے گا۔ دولت کی پیدائش، تقسیم، تبادلہ اور تمام معاشی سسٹم اور جو پروسیجرز (procedures) ہیں، وہ سب بدلنے ہوں گے۔ تب تو ایک مکمل اسلامی معاشی نظام چل سکتا ہے۔ اس سرمایہ دارانہ سسٹم کے اندر رہتے ہوئے صرف بینک کو اسلامائز کیا جائے تو یہ ٹیکنیکلی طور پر ممکن نہیں ہے۔ عملاً ایسا ہونا ممکن نہیں۔

مولانا تقی عثمانی صاحب کی رپورٹ بھی پڑھ لیں۔ انھوں نے بھی بہ الفاظِ دیگر یہ اعتراف کیا تھا کہ اس سسٹم میں رہتے ہوئے یہ کام نہیں ہوسکتا، البتہ ہم اس کو اسلامائزیشن کی طرف لانے کے لیے کچھ حیلے اور کچھ طریقے اختیار کر سکتے ہیں۔ وہ حیلے علما جانتے ہیں، جیسے ''**بیع العینہ**'' کا حیلہ ہے۔ اسی طریقے سے ''اجارہ'' وغیرہ جیسے طریقے اختیار کر کے سرمائے کا ریٹرن کرائے کی صورت میں لینے کی کوشش کی گئی۔ اس طرح شرعی طور پر ناجائز ''**صفقة فی صفقة**'' (معاملہ درمعاملہ) کی صورتِ حال پیدا ہوئی۔ کچھ حیلوں کے ذریعے سے انھوں نے اس کو اسلامی بنانے کی کوشش کی اور اس کے لیے بھی بہت سی کڑی شرائط بنانی پڑیں۔ چند شرطیں خود علما کی اس کمیٹی نے تجویز کیں کہ یہ ہوں گی تو یہ بینک کسی درجے میں اسلامی بنے گا، لیکن جب عمل درآمد کا مرحلہ آیا تو علما کو ایک طرف کر دیا گیا اور یہ رپورٹ بینکنگ سیکٹر کے ماہرین کے حوالے کر دی گئی۔ انھوں نے ان شرائط کو پیشِ نظر رکھے بغیر اُن حیلوں کی اساس پر ایک نظام بنایا تھا، جس پر خود مولانا تقی عثمانی صاحب کی اس زمانے میں ''البلاغ'' میں تنقید موجود ہے کہ ہم نے شرائط کے ساتھ بات کی تھی، مگر یہ انھوں (حکومتِ وقت) نے نہیں کیا۔ پھر کچھ عرصے کے بعد کچھ شرائط مانی گئیں۔ پھر بھی ترمیمات کا سلسلہ اب تک جاری ہے اور ابھی بھی اُن حیلوں میں وہ تمام شرائط کامل طور پر نہیں سامنے آئیں۔ نجی مجلس میں مولانا اس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ ہم جس طریقے سے چاہتے تھے، ویسا نہیں ہے، لیکن بس اس کو یوں سمجھا جائے کہ ایک اسلامی معاشی نظام کی طرف بڑھنے کی ایک ابتدائی ناقص اور ادھوری سی ایک کاوش ہے۔ تو یہ کوئی مکمل اسلامی بینکنگ نہیں ہے۔

دیکھیے! ہر سسٹم کے اپنے تقاضے ہوتے ہیں۔ مثلاً کرولا کار کے اندر سوزوکی کا پرزہ نہیں لگا سکتے۔ اسی طرح سرمایہ داری ایک مکمل نظام ہے۔ بینک اس کا ایک کَل پرزہ ہے۔ سوشلزم ایک نظام ہے۔ اس کے شعبے، اس کے پرزے اپنے ہیں۔ اسلام کا اپنا ایک مکمل معاشی نظام ہے، اس کے اپنے کَل پرزے ہیں۔ ایسا نہیں ہوسکتا کہ ایک سسٹم کا ایک پرزہ نکال کر دوسرے میں لگا کر کہیں کہ یہ رواں ہوگیا۔ کیسے ہوگیا؟ اب میزان بینک وہی قرضہ دیتا ہے جو عام بینک دیتا ہے۔ میزان کا قرضہ مہنگا، دوسروں کا سستا کیوں ہے؟ پھر اگر وقت پر اُس نے قرضہ ادا نہ کیا تو عام بینک تو سود وصول کرتا ہے دُگنا تگنا جو بھی طے ہو۔ میزان والوں نے حیلہ بنایا کہ ''**جبر فی التبرّع**''، یعنی زبردستی ان سے کہا جائے کہ خیرات (charity) میں حصہ لو۔ وہ چیریٹی بھی ہمارے بینک میں جمع کرانی ہے، باہر نہیں دے سکتے۔ گویا کان اِدھر سے نہیں پکڑا، اُدھر سے پکڑ لیا۔ انھوں نے اُتنی شرح پر سود لیا ہے، آپ نے اس کو چیریٹی قرار دے کر لے لیا۔ کیا شریعت کے اندر ہدیہ اور صدقہ جبری طور پر لیا جاسکتا ہے؟ یہ تضادات ہیں۔ اس لیے اس کا

www.rahimia.org

ابھی مزید جائزہ لینے کی ضرورت ہے۔ جب تک سسٹم کے باقی امور سامنے نہ ہوں، تو کسی ایک چیز کو ہم اسلامی نہیں کہہ سکتے۔

سوال: پاک چائنہ اکنامک کوری ڈور CPEC سے معیشت کے اندر ایک نیا موڑ آیا ہے۔ اس تناظر میں حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے حوالے سے آپ کیا رہنمائی دیں گے؟ اقوامِ عالم کے ساتھ تجارت کے تناظر میں اگر دیکھ لیا جائے؟

جواب: اللہ کرے کہ اس کا فائدہ آپ کے ملک کو ہو جائے۔ خوشیاں تو ہم بہت منا رہے ہیں کہ چھیالیس ارب ڈالر چائنہ سے ہمارے پاس آ رہے ہیں۔ لیکن دیکھئے! دنیا میں آپ کسی سے بھی قرضہ لیں، یا کسی کے ساتھ بھی مل کر کوئی معاہدہ کریں، وہ نفع بخش (fruitful) تبھی ہوتا ہے کہ جب ہمارے ہاں اپنا ایک مضبوط اور مستحکم سسٹم ہو۔ ہمارے ادارے فعال ہوں اور ہم اُس سے نتیجہ پیدا کرنے کی اہلیت اور صلاحیت رکھتے ہوں۔ پھر تو ترقی اور کامیابی ہوتی ہے۔ اگر ایسا نہ ہو تو پھر اُس کا نتیجہ دوسرا ملک — جو آپ کو اپنے مفادات کے لیے پیسہ دے رہا ہے — فائدہ اٹھائے گا۔ اب سی پیک سے سب سے زیادہ فائدہ چائنہ کا ہے کہ اُسے پچاسی فی صد سفر کی رعایت مل جائے گی۔ اب تک اُسے اپنا مال ایشیا اور افریقا میں پہنچانے کے لیے بحرالکاہل کا طویل ترین سمندری راستہ اختیار کرنا پڑتا تھا، اب اُسے اپنا مال ایشیا میں پہنچانے کے لیے صرف پندرہ فی صد راستہ استعمال کرنا پڑے گا۔

ابھی آپ نے دیکھا کہ پچھلے سال (2016ء) میں چین کا ایک قافلہ (convoy) گزرا ہے، تو وہ اٹھارہ دنوں میں خنجراب سے گوادر کے گرم پانی میں پہنچا۔ یہاں چائنہ سے بحرالکاہل کے راستے سے آتا تھا تو تقریباً ایک ڈیڑھ مہینہ لگتا تھا۔ ان دنوں کا پٹرول، جہاز کا خرچہ اور دیگر جو لیبر ہے وغیرہ، ان سب کی بچت اس کو ہوئی۔ آپ کو کیا ملا ہے؟ اس کے ساتھ ایک ڈویژن فوج تھی (ہم نے خود اس کا مشاہدہ کیا، میں اس وقت بنوں میں تھا، ہمارے سامنے سے وہ قافلہ گزرا) تو آپ دیکھئے کہ وہاں صرف فوج کو اس کا معاوضہ ملے گا کہ فوج کا پورا ڈویژن اس کی حفاظت کے لیے تعینات تھا۔ اب ہمارے ملک کو فائدہ تو تب ہوگا کہ جب ہمارے ہاں قومی تقاضوں کے مطابق ان وسائل سے استفادے کا سٹرکچر اور بہترین نظام موجود ہو۔

آپ بتلائیے کہ چھیالیس ارب ڈالر کا معاہدہ چینی صدر آپ کے ساتھ کر کے جاتا ہے اور وہ خنجراب سے گوادر تک سڑک بنا رہا ہے۔ یہاں سے جاتے ہی اگلے مہینے وہ انڈیا پہنچ گیا۔ مودی (بھارتی وزیر اعظم) کے آبائی شہر احمد آباد گجرات میں اُس نے چھبیس ارب ڈالر میں بلٹ ٹرین چلانے کا معاہدہ کیا، جو کلکتہ سے چلے گی اور امرتسر آئے گی۔ اُس ٹرین کے نتیجے میں آپ بتلائیے کہ کلکتہ سے چلنے والی ٹرین امرتسر آ کر کیا کرے گی؟ امرتسر پر آ کر تو سرحد بند ہوگئی۔ تو کیا یہ کسی نہ کسی گریٹ گیم کا حصہ تو نہیں ہے؟ کہ کل کو یہی دروازہ کھلے اور آ کر آپ کے سی پیک کے ساتھ مل جائے۔ اور یہاں سے طورخم (افغانستان) چلا جائے تو آپ تو زیادہ سے زیادہ اس راہ داری کا کرایہ وصول کریں گے۔ یہی اب تک کا جو اندازہ اور تجربہ ہو رہا ہے۔ کیوں کہ قومی سوچ کے ساتھ ہمارا اپنا معاشی ڈھانچہ اور نظام موجود نہیں ہے۔

پھر ایک اَور بات بھی دیکھئے! سٹیٹ بینک کے اہم ترین لوگوں سے جو ہماری میٹنگز ہوئی ہیں، اس کی روشنی میں یہ معلومات ملیں کہ آپ کے جو آڈٹ اور فنانس سے متعلق لوگ ہیں، ان کے بہ قول چائنہ کا یہ پیسہ آپ کے فنانس سسٹم میں داخل ہی نہیں ہو رہا۔ کس راستے سے آنا ہے؟ اور کس راستے سے خرچ ہونا ہے؟ یہ صرف یہاں کا حکمران طبقہ جانے یا چین کی کمپنیاں جانیں۔ چینی بینک براہِ راست شریک (involve) ہے۔ جب کہ آپ کے بینکوں میں، آپ کے سٹیٹ بینک میں وہ پیسہ کھاتوں میں نہیں

www.rahimia.org

چڑھ رہا کہ آپ کے پاس آیا ہو اور پھر یہاں سے آپ نے اخراجات کے لیے آگے مہیا کیا ہو۔ اگر ملک کے ملکیتی قومی فنانس سسٹم میں پیسہ داخل (inject) ہی نہیں ہو رہا اور قرضے کے طور پر آپ کے اوپر مسلط ہو رہا ہے، اس کے فوائد کون اٹھائے گا؟ اس طرح باہر ہی باہر کمپنیوں سے سودے ہو رہے ہیں۔

اس صورتِ حال میں یہاں کی ہر جماعت کے سیاسی مافیاز کا مطالبہ کیا ہے؟ چھوٹے صوبوں کا بھی یہی مطالبہ ہے کہ ہمیں CPEC کا روٹ بتاؤ کون سا ہے؟ تا کہ اُس روٹ پر غریبوں سے سستی زمینیں خرید لیں اور پھر مہنگے داموں سی پیک کو بیچیں۔ خنجراب سے لے کر گوادر تک یہ پورا روٹ دیکھ لیجیے۔ جیسے ہی روٹ کا اعلان ہوا ہے، یہاں موجود جتنے بھی سیاسی نمائندے کسی بھی پارٹی کے تھے، نون لیگ کے ہوں، پیپلز پارٹی کے ہوں، عمران خان کے ہوں، مولانا صاحب کے ہوں، انھوں نے اس روٹ پر آنے والی زمینیں غریبوں سے اونے پونے داموں میں خریدی ہیں۔ انھیں آگے فروخت کر کے کمانے کے منصوبے ہیں۔ وہی مافیاز جو سرمایہ دارانہ نقطہ نظر سے پہلے سے ملکی وسائل پر قابض ہیں، یہ فائدہ اُن کا ہوگا۔ عوام کا فائدہ تو تب ہوگا کہ جب عوامی مفاد یا رائے کلی کے تناظر میں سسٹم بنے۔ اخلاقِ فاضلہ کے تقاضوں پر سسٹم بنے۔ ٹیکنالوجی کا استعمال ملک کے قومی مفاد کے تناظر میں ہو تو ولی اللّٰہی نقطہ نظر سے سی پیک درست ہوگا۔ اگر ایسا نہیں تو ولی اللّٰہی نقطہ نظر سے سرمایہ داری نظام کا آلہ کار ہوگا۔

سوال: اسلام جب آیا تو وہ تھیسز (Thesis) کس سسٹم کا تھا؟ اور اس کے بعد پھر اُس کا اینٹی تھیسز (Anti thesis) کیا آیا؟ اگر اینٹی تھیسز آتا ہے تو دنیا اسے قبول کر سکتی ہے؟ اور اگر نہیں کر سکتی تو اسلام کے بعد جو تھیسز بنے، اور ہم دوبارہ اسلام کو دوبارہ تھیسز کیسے بنا سکتے ہیں؟

جواب: یہ جو بات کی گئی تھی، وہ مارکسزم یا ہیگل کے فلسفے کے نقطہ نظر سے بیان کی گئی تھی۔ اسلام کا نقطہ نظر تو یہ نہیں ہے کہ انسانیت میں جدل کو تسلیم کیا جائے یا اس جدلیت کی اساس پر اس میں سے کوئی مشترکہ امر یا Synthesis نکالا جائے۔ ایک پورے نظام کے حوالے سے یہ تو مقدمہ ہی سرے سے غلط ہے۔ اسلام کا دعویٰ یہ ہے کہ کل انسانیت، نوع کے اعتبار سے ایک وحدت لیے ہوئے ہے۔ انسانی تقاضوں میں کالے، گورے، مشرقی، مغربی، مسلمان، غیر مسلم کا اپنے معاشی تقاضوں کے حوالے سے آپس میں کوئی جدل نہیں ہے۔ ہر انسان کو بھوک لگتی ہے، پیاس لگتی ہے، گرمی سردی سے بچاؤ کی ضرورت ہے، اس کی معاشی ضروریات ہیں۔ وہ معاشی ضروریات بلاتفریق رنگ، نسل و مذہب، وحدتِ انسانیت کی اساس پر کل انسانیت کی معاشی ضروریات کے مہیا کرنے کے لیے جو معاشی نظام وسائل فراہم کرے گا، وہ اسلامی نظامِ معیشت کہلائے گا۔

انسانوں میں پہلے جدل ماننا اور پھر جدل کی بنیاد پر ''سن تھیسز'' کا اشتراکی تصور لانا اور پھر اس کو اگلے مرحلے میں تھیسز قرار دینا، یہ ہیگلزم مارکسزم کی فلاسفی تو ہو سکتی ہے، اسلام کا نقطہ نظر تو نہیں ہے۔ کیا آج سے چودہ سو سال پہلے یا کئی ہزار سال پہلے انسان کو بھوک نہیں لگتی تھی؟ یا کم لگتی تھی؟ یا گرمی سردی سے بچاؤ کی اس دور میں اَور کوئی ضرورت تھی اور آج اَور ہے؟ ظاہر ہے کہ انسان کے نوعی تقاضوں میں کوئی فرق نہیں پڑا۔ جب ان نوعی تقاضوں میں کوئی فرق نہیں پڑا تو اس حوالے سے وہ ایک نوعی وحدت کی صورت لیے ہوئے ہے۔ لہٰذا قیامت تک کے لیے چودہ سو سال پہلے اس کی ضروریات کی تسکین کا جو مجموعی ڈھانچہ اسلام نے دیا ہے، اس کی اہمیت آج بھی اُسی طریقے سے برقرار ہے۔

www.rahimia.org

باقی رہی یہ بات کہ ذرائع پیداوار میں تبدیلی آئی ہے تو وہ آنی بھی چاہیے اور وقت کے ساتھ ساتھ آتی رہتی ہے۔ اب اُن ذرائع پیداوار یا اُس ٹیکنالوجی کو کل انسانیت کے مفاد کے لیے بنانا، یہ اسلام کی تعلیمات کا حصہ ہے۔ جو بھی ٹیکنالوجی آئے، اس کے تناظر میں احتیاجات کا تعین کریں اور اُسی کے مطابق ہی ان وسائل کو پیدا کر کے اُن وسائل کے ذریعے سے احتیاجات کی تسکین کا نظام بنائیں۔

سوال: آپ نے بڑے خوب صورت انداز میں اسلام کا معاشی نظام شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے فکر کے حوالے سے پیش کیا ہے۔ ہمیں یہ معلوم ہوا کہ کیپٹلزم اور سوشلزم کے مقابلے میں اسلام بالکل different اور اعلیٰ اور ارفع نظام ہے، لیکن ہمارے سامنے ایک اَور مسئلہ یہ آتا ہے کہ فکرِ ولی اللّٰہی کے ایک بڑے شارح تھے مولانا عبیداللہ سندھیؒ (1944ء) اُن کے بارے میں عمومی طور پر یہ تأثر پایا جاتا ہے کہ وہ روس کے سوشلزم سے متأثر ہوگئے تھے اور انھوں نے ان کے نظریات کے پرچار کے لیے کام کیا۔ یہ شبہ کس حد تک درست ہے؟ اس کی وَجہ کیا ہے؟

جواب: اس کی وَجہ یہ ہے کہ مولانا عبیداللہ سندھیؒ حریت پسند اور freedom fighter تھے۔ برطانوی سامراج کے خلاف انھوں نے آزادی کی جنگ لڑی۔ چوبیس پچیس سال باہر رہ کر اور پندرہ بیس سال ہندوستان میں رہ کر یہ جدوجہد اور کوشش کی۔ اس جدوجہد کے نتیجے میں اُن پر تحریکِ ریشمی رومال کے تناظر میں انگریزوں نے ایک مقدمہ اس عنوان سے دائر کیا تھا: ''ملکہ معظّمہ بنام عبیداللہ سندھی''۔ اُس مقدمے میں مولاناؒ کو برطانوی شہنشاہیت نے اپنا مجرم قرار دیا تھا۔ مولاناؒ جب مجرم قرار پائے تو مولاناؒ کا ملک میں داخلہ بند ہوگیا کہ وہ غدار ہیں اور انھوں نے بغاوت کی ہے، لہٰذا وہ اس ملک میں نہیں آسکتے۔

انڈیا ایکٹ 1935ء کے تحت جب یہاں سیاسی آزادی حاصل ہوئی اور جماعتوں کو الیکشن لڑنے اور صوبائی حکومتیں بنانے کی اجازت دی گئی تو پھر یہاں کے سیاسی لیڈروں نے بالخصوص مولانا سیّد حسین احمد مدنیؒ، مولانا ابوالکلام آزادؒ اور کانگریس کے لیڈروں نے باقاعدہ طور پر برطانیہ کو درخواست کی کہ ہمارے جتنے بھی باہر کے جلاوطن لوگ سیاسی لیڈر ہیں، ان کو واپس آنے کی اجازت دی جائے۔ اس لیے کہ سیاسی آزادیاں ہوں گی، الیکشن تبھی لڑا جائے گا۔ چوں کہ مولانا سندھیؒ اپنے آپ کو صوبہ سندھ سے وابستہ کر چکے تھے تو سندھ کانگریس کے صدر پنڈت چوئتھ رام تھے۔ انھوں نے حکومتِ برطانیہ کو باقاعدہ آفیشل لیٹر لکھا کہ ہمارے سندھ کے ایک رہنما مکہ معظّمہ میں جلاوطنی کی زندگی بسر کر رہے ہیں، ان کو واپس لایا جائے۔

برطانوی سرکار نے اُس خط کے جواب میں سندھ کانگریس کے پریزیڈنٹ کو لکھا کہ مولانا سندھیؒ کیمونسٹ ہو چکے ہیں۔ وہ روس گئے تھے اور انھوں نے سوشلزم قبول کرلیا۔ سوشلزم اور ہمارے سرمایہ داری نظام، دونوں کے درمیان جنگ ہے، اور ہم اپنے کسی بھی دشمن کو اپنے ملک میں آنے کی اجازت نہیں دے سکتے اور دو چار مزید اعتراضات اُن پر کیے۔ اس پر اس حوالے سے پنڈت صاحب نے حضرت سندھیؒ کو اس سلسلے میں ایک خط لکھا، جس میں اس حوالے سے سوالات کیے گئے تھے۔ جو آج بھی کراچی نیشنل میوزیم کے آرکائیو میں محفوظ ہے تو مولانا سندھیؒ نے 18 صفحات پر مشتمل اس کا جواب دیا۔ اُس میں خاص طور پر یہ الزام کہ حکومتِ برطانیہ نے کہا ہے کہ آپ سوشلسٹ ہیں اور آپ نہیں آسکتے۔ تو مولانا نے اس کا جواب لکھا کہ

میں روس گیا۔ وہاں رہا اور سوشلزم کا مطالعہ میں نے کیا۔ یہ بھی کہا کہ میں شروع میں یورپین زبان نہیں جانتا تھا۔ میں نے اپنے رُفقا کے ذریعے سے سوشلزم کا مطالعہ کیا مثلاً ظفرحسن ایبک وغیرہ وغیرہ۔ اور یہ میرا علمی اور قانونی حق ہے کہ دنیا کے کسی بھی علم وفکر یا کسی بھی نظام کا میں مطالعہ کروں۔ اس پر دنیا میں کوئی پابندی (ban) نہیں لگا سکتا۔ جہاں تک سوشلزم کو قبول کرنے کی

www.rahimia.org

بات ہے تو یہ دعویٰ غلط ہے۔ میں نے کبھی بھی کیمونزم یا سوشلزم کو اپنا نصب العین قرار نہیں دیا۔ مولاناؒ لکھتے ہیں:

''میرا دعویٰ ہے کمیونسٹ ریولیشن کو میں نے کبھی اپنا سیاسی عقیدہ (کریڈ) نہیں بنایا اور نہ آئندہ میرے جیسے لوگوں سے یہ ممکن ہے۔ گورنمنٹ اپنی معلومات پر احتیاط سے نظر ثانی کرے گی تو وہ خود اس کی شہادت دے گی۔ ... جو لوگ میری علمی سائیکالوجی سے واقف ہیں، وہ کبھی مان نہیں سکتے کہ میں کمیونسٹ کریڈ قبول کر سکتا ہوں۔''

میرا عقیدہ اور نصب العین (creed) اسلام ہے اور اس اسلام کی میں وہ تعبیر مانتا ہوں، جو امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے کی ہے۔ اس سلسلے میں میرے دو استاد ہیں: ایک شاہ ولی اللہ اور دوسرے میرے اپنے براہِ راست استاد شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ۔ میں ان دونوں کا تعبیر کردہ اسلام مانتا ہوں۔ ضروری نہیں کہ باقی لوگوں کی جو تعلیماتِ اسلام ہیں، میں ان کو تسلیم کروں۔

میں حکومتِ برطانیہ کو چیلنج کرتا ہوں کہ وہ اپنی کسی سی آئی ڈی کی رپورٹ سے یا اپنی کسی دستاویز سے یہ ثابت کرے کہ میں نے کبھی اور کسی بھی مرحلے پر سوشلزم قبول کیا ہو۔ میرے جیسا دبنگ آدمی چھپ کر کوئی بات نہیں قبول کیا کرتا۔ مجھے جب پتہ چلا کہ میرا ہندو دھرم یا سکھ دھرم میرے مسائل حل کرنے کا قائل نہیں ہے تو میں نے بہ بانگِ دُہل ماں چھوڑی، بہن چھوڑی، غرض! ہر چیز چھوڑی، میں نے اسلام قبول کرلیا۔ اگر روس جا کر مجھے ایک لمحے کے لیے بھی معلوم ہوتا کہ اسلام میرے مسائل کا حل نہیں ہے تو میں بہ بانگِ دُہل اعلان کر دیتا کہ میں آج کے بعد اسلام چھوڑتا ہوں اور میں کمیونسٹ ہوجاتا۔ لہٰذا میرے بارے میں غلط معلومات ہیں۔

مولانا سندھیؒ نے یہ خط لکھا اور اُس خط کو بنیاد بنا کر پنڈت صاحب کا برطانیہ سے پھر اگلا ڈائیلاگ ہوا۔ مولانا سندھیؒ 1939ء میں یہاں آئے۔ مولانا سندھیؒ پر سب سے پہلے برطانوی حکومت نے کمیونسٹ ہونے کا یہ الزام لگایا۔ مولانا سندھیؒ یہاں آ کر آرام سے تو نہیں بیٹھ سکتے تھے۔ ظاہر ہے کہ انھوں نے یہاں کی سیاست میں حصہ لینا تھا۔ یہاں چاہے کسی پارٹی میں ہوتے، کانگریس میں تو پہلے سے تھے، مولانا انڈین نیشنل کانگریس کابل کی شاخ کے صدر بھی رہے تو انھوں نے آزادی اور حریت کی بنیاد پر کام کرنا تھا۔ اس میں رکاوٹ ڈالنے کے لیے ایک تو شرائط کے ساتھ مولانا سندھیؒ کو یہاں آنے کی اجازت ملی۔ دوسرے مولانا چوں کہ متحرک آدمی تھے، اور اُن کی تحریک سے برطانیہ کی حکومت ہلتی تھی، تو اس لیے برطانیہ نے ان کے خلاف لوگوں کے ذریعے سے یہ پروپیگنڈا کرایا کہ مولاناؒ کمیونسٹ ہوگئے اور کیمونزم کی باتیں کرنا شروع کر دی ہیں۔ کیا کوئی آدمی مولاناؒ کی اپنی کسی تحریر سے یہ بات دکھا سکتا ہے کہ مولاناؒ نے کیمونزم یا سوشلزم کی بات کہی ہو؟ کوئی نہیں! یہ سب پروپیگنڈا ہے جو جھوٹ پر مبنی ہے۔ اس کی کوئی بنیاد نہیں ہے۔ زیادہ سے زیادہ یہ ایک سیاسی الزام تراشی ہے جو کسی دوسرے کو فیل کرنے کے لیے اور کام نہ کرنے دینے کے لیے کی جاتی ہے۔ پھر مولاناؒ نے آ کر یہاں جو جدوجہد شروع کی اور ولی اللّٰہی فکر کی اساس پر سیاسی، معاشی، سماجی، علمی کام شروع کر دیا تو اس سے برطانوی سسٹم نے لرزنا تھا۔ یہ بہت عجیب بات ہے کہ ولی اللّٰہی فکر پر کام کرنے کے باوجود مولاناؒ کمیونسٹ تھے؟!

ہندوستان میں مولانا سندھیؒ کے آنے کے بعد ان کے خلاف دو طبقے تھے: ایک طبقہ تو نام نہاد اسلام پسند یا رجعت پسند علما کا تھا۔ انھوں نے مولاناؒ پر یہ الزام تراشی کی کہ یہ کمیونسٹ ہوگئے۔ دوسری طرف اگر ہم کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا کی تاریخ اٹھا کر دیکھیں، اس نے باقاعدہ سرکلر جاری کیا کہ: ''ہمارا جو بھی کامریڈ ہے، وہ سوائے عبیداللہ سندھیؒ کے کسی بھی مولوی سے مل سکتا ہے۔'' انھوں نے لکھا کہ: ''ہر مولوی سے آپ مل سکتے ہیں کیوں کہ اُس کی رجعت پسندی کا توڑ کیا جا سکتا ہے، لیکن اگر نہیں مل

www.rahimia.org

سکتے تو عبیداللہ سندھیؒ سے۔''

گنگارام مینشن لاہور میں حکیم محمد قاسم صاحب اپنے مطب میں بیٹھتے تھے۔ وہ جامعہ ملیہ قرول باغ دہلی کے فارغ التحصیل تھے اور حکیم اجمل خان کے شاگرد تھے۔ خود انھوں نے ہمیں اپنا واقعہ سنایا کہ میں کامریڈ بن گیا اور کمیونسٹ پارٹی میں چلا گیا۔ ہم اس کے سٹڈی سرکل میں شریک ہوتے تھے۔ اب چوں کہ ہم کمیونسٹ تھے، ظاہر ہے کہ ہمارے ماں باپ مسلمان خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ ہمارے خلاف خاندان کے اندر بڑا ردِعمل تھا۔ اور ماں باپ بھی ہم سے چھوٹ گئے کہ ہم اپنے انقلابی جوش میں کمیونسٹ بن چکے تھے۔ ہمارے سٹڈی سرکل میں ایک دن کمیونسٹ پارٹی کا وہ سرکلر پڑھا گیا کہ یہ مرکز سے آیا ہے۔ یہ تمام کامریڈوں کے نام ہے کہ: ''وہ ہر مولوی سے مل سکتے ہیں مگر عبیداللہ سندھیؒ سے نہیں مل سکتے۔'' حکیم قاسم صاحب ہنستے ہوئے ضرب المثل بیان کیا کرتے تھے کہ: ''انسان کو جس چیز سے روکا جائے، انسان اُدھر ضرور بھاگتا ہے۔'' ہم نے کہا کہ یار ایسا کیسا مولوی ہے! جس سے کمیونسٹ بھی ڈرتے ہیں تو کیوں نہ اُس سے ملا جائے؟ ہم مولانا سندھیؒ کے پاس گئے۔ اب جب مولاناؒ سے بات چیت ہوئی اور ولی اللّٰہی فلاسفی پر انھوں نے گفتگو کی تو ہماری تو آنکھیں کھل گئیں۔ ہم نے کہا کہ بھئی! اس طرح تو ہمارا ایمان بھی بچتا ہے۔ ہمارا مقصد تو غربت کا خاتمہ اور ظلم و ستم کو ختم کرنا تھا، اگر ہم کمیونسٹوں میں رہ کر یہ کام کریں تو اس میں تو ہمارا ایمان جاتا ہے۔ یہاں ایمان بھی بچتا ہے اور غریبوں کے لیے کام بھی ہوتا ہے۔ آم کے آم، گٹھلیوں کے دام۔ اس طرح ہم تو مولانا سندھیؒ کے عاشق ہوگئے۔ ہم نے کمیونسٹ پارٹی چھوڑی اور مولاناؒ کے شاگرد بن گئے۔ یہ عجیب کمیونسٹ ہے کہ جس پر کمیونسٹ پارٹی کہتی ہے کہ یہ مولوی اتنا شدت پسند ہے کہ ہمارے جدید لبرلزم اور کمیونزم کو توڑ رہا ہے اور ماشاء اللہ! علما کہتے ہیں کہ: ''یہ کمیونسٹ ہیں؟!''

سوال: آپ نے اسلامی معیشت کی بنیاد محنت کو قرار دیا ہے، جب کہ آج مشینی دور ہے۔ اس مشینی دور میں محنت تو تقریباً ختم ہوجاتی ہے۔ اس مشینی دور میں کیا رہنمائی ہوگی؟

جواب: انسانی محنت کے بغیر تو کوئی بھی کام نہیں ہوتا۔ مشین بھی ایجاد ہوجائے تو مشین کو چلانے کے لیے دیکھ بھال اور نگرانی کا نظام تو بنانا پڑے گا۔ اصل سوال یہ ہے کہ جو ٹیکنالوجی بھی دریافت ہوئی ہے، اس کا مفاد کس کو ہونا چاہیے؟ کیا اجتماع کو یا ایک مخصوص طبقے کو؟ انسان اس دنیا میں جب تک ہے تو ہر ایک ٹیکنالوجی کے استعمال کے لیے انسانوں کی ضرورت رہے گی۔ لہٰذا جو ٹیکنالوجی بھی دریافت ہو، تو اس کے نتیجے میں فائدہ تمام انسانوں کو ہونا چاہیے۔ یہ ایک مخصوص طبقے کے لیے نہیں۔

صدارتی کلمات

پروفیسر ڈاکٹر محمد اکرم رانا۔ سابق چیئرمین شعبہ علومِ اسلامیہ، بہاء الدین زکریا یونیورسٹی، ملتان

بسم اللّٰہ الرّحمٰن الرّحیم. نحمدہٗ و نصلّی علیٰ رسولہٖ الکریم.

أمّا بعد! قال اللّٰہ تبارک و تعالیٰ فی کلامه المجید و الفرقان الحمید:

''وَمَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِيْ فَاِنَّ لَهٗ مَعِيْشَةً ضَنْكًا'' [31] **صدق اللّٰہ العظیم.**

اللہ تبارک و تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ: ''جس نے بھی میرے ذکر سے منہ موڑا، یقیناً ہم اُس کے لیے معیشت کو تنگ کردیں گے۔'' آج کے موضوع کا عنوان معیشت کے حوالے سے ہے۔ شاہ ولی اللہؒ کی فکر کے حوالے سے اسے آپ نے سنا۔ اس اتنے

www.rahimia.org

بڑے دل پذیر خطبے اور اتنی خوب صورت باتوں کے بعد میں نہیں سمجھتا کہ اس میں کوئی گنجائش ہے۔ تاہم ایک بات ضرور اس میں اضافہ کرنے کی کوشش کرتا ہوں کہ اللہ تبارک و تعالیٰ نے اپنی کتاب میں فرمایا: ''جو ہمارے ذکر سے منہ موڑے گا، تو اس کی معیشت تنگ ہوگی۔'' یہاں ذکر سے مراد اُصول ہیں۔ جب ہم اُن اصولوں پر عمل کریں گے، جب ہم معیشت کے اصولوں پر اُس کی اصل کتاب کے مطابق کام کریں گے تو یقیناً ہماری معیشت مضبوط ہو جائے گی۔ آج ہمارے جو اصول ہیں، ہم ان کو چھوڑے بیٹھے ہیں۔

امریکا میں ایک پروفیسر سے ملاقات ہوئی۔ اُن سے اسلام کے معاشی نظام پر کافی گفتگو رہتی تھی۔ میرا دوست تھا۔ ہم چائے اکٹھے پیا کرتے تھے۔ میں نے کہا کہ اسلام کا یہ جو نظامِ معیشت ہے، وہ تمام نظاموں سے بڑھ کر ہے اور اس کے پاس تمام مسائل کا حل موجود ہے، جس سے کسی بھی سوسائٹی کو اچھے طریقے سے چلایا جاسکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ وہ میری بات سے بڑا چونکا۔ اس نے کہا: کیا آپ کے پاس ایک نظام موجود ہے؟ میں نے کہا: بالکل موجود ہے۔ اس نے کہا کہ ہم اس بات کو نہیں مانتے کہ آپ کے پاس اسلام کا نظامِ معیشت ہے۔ ہاں! بس چند اصول ہیں آپ کے پاس، آپ ان اصولوں کو لے کر پھر رہے ہیں، اَور آپ کے پاس کچھ بھی نہیں ہے۔ بس یہ بہر حال ایک چیلنج ایبل (challengeable) لمحۂ فکریہ تھا میرے لیے کہ جس طرح ہماری تاریخ، ہمارا دین، ہمارے نبی پاک ﷺ کی تعلیمات اور قرآن مجید کی جو تعلیم ہے، ان کو اس نے مسترد (reject) کر دیا۔

اصل لمحۂ فکریہ ہے کہ اتنا بڑا نظام جو ایک ہزار سال تک جس کا تذکرہ محترم مفتی صاحب نے بھی کیا ہے، وہ قابلِ عمل رہا اور وہ نظام برصغیر کے حوالے سے بھی ایک مضبوط اور پائیدار رہا۔ اب کیا مسئلہ ہو گیا ہے کہ آج ہم اس معیشت کے نظام کو کیوں نہیں دنیا کے نظام پر غالب کر سکے؟ جہاں جہاں کمزوریاں ہیں، مفتی صاحب نے اُن کی نشان دہی کر دی ہے کہ ان کمزوریوں کے ازالے کے طریقہ ہائے کار پر اگر ہم چلیں گے تو ہمارا نظام بھی مضبوط ہو جائے گا۔ ہم بیرونی معیشت کے مقابلے میں جو ہمارا اپنا نظامِ معیشت ہے، اس کو ہم استوار کریں گے۔ لہٰذا ضروری ہے کہ سرمایہ دارانہ نظام اور اشتراکیت کے مقابلے پر ہم اُن اصولوں کو سمجھیں اور اُن پائیدار اصولوں پر عمل کریں، جو شاہ ولی اللہؒ نے آج سے دو سو سال پہلے ہمیں بتائے تھے۔ آج کی جو جو ضرورت ہے، اس ضرورت پر ہمیں عمل پیرا ہونا ہوگا۔ تب جا کر ہم کوئی کامیابی کی منزل طے کر سکتے ہیں۔

بہر حال بہت اچھی باتیں ہوئی ہیں۔ اب مزید اس پر کوئی بات کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں آج کی اس تقریب — جو موسیٰ پاک شہید چیئر کے زیرِ اہتمام ہوئی ہے — میں انھیں مبارک باد پیش کرتا ہوں۔ اس کے جتنے بھی منتظمین ہیں، ان کا بھی میں شکریہ ادا کرتا ہوں، جس لیکچر کا اہتمام کیا گیا ہے، وہ ہمارے طلبا کے لیے، طالبات کے لیے، ہمارے پی ایچ ڈی اور ایم فل کے طلبا کے لیے اور اساتذہ کے لیے بھی میں سمجھتا ہوں کہ ایک رہنمائی کا ریسورس (resource) ہے۔ اور فکری، سماجی اور معاشی رویوں میں ہمیں چینج (change) کی ضرورت ہے۔

آخری بات یہ ہے کہ ہم جب سے تعلیم کے نظام میں آئے ہیں، لیکچرز ہی سنتے آئے ہیں، لیکن الحمدللہ! جو آج کا لیکچر ہے، اور اس سے پہلے کے جو لیکچرز ہیں، میں جناب مولانا مفتی عبدالخالق آزاد صاحب کو مبارک باد پیش کرتا ہوں اور اُن کے علم کی قدر کرتا ہوں کہ انھوں نے ایک ایسا تجزیہ پیش کیا ہے جو شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی فکر سے ہم آہنگ ہو کر ہمیں اسلامی اصولوں پر چلانے کے ان شاء اللہ قابل بنائے گا۔ آخر میں مَیں تمام طلباء و طالبات کو مبارک باد پیش کرتا ہوں کہ انھوں نے بڑے تحمل سے اور بڑی برداشت کے ساتھ اپنے آپ کو وقف کرتے ہوئے ایک لمحہ بھی یہ محسوس نہیں ہونے دیا کہ انھیں کوئی بوریت کا شائبہ ہو رہا ہے۔

www.rahimia.org

اللہ تبارک و تعالیٰ سے میری دعا ہے کہ وہ ہمیں اسلامی اصولوں پر اور اسلام کے خصوصاً نظامِ معیشت کو سمجھنے کی توفیق عطا فرمائے۔ کیوں کہ یہی ایک نظام ہے۔ بڑا افسوس ہوتا ہے کہ جب ہم دیکھتے ہیں کہ ایک نظام سرمایہ دارانہ نظام کی شکل میں ہم پر زبردستی مسلط ہے۔ ہم طوعاً وکرہاً اس پر عمل کیے جا رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اس مشکل سے نجات دلائے۔ آمین!

صدارتی کلمات کے بعد صدر شعبہ علومِ اسلامیہ جناب ڈاکٹر عبدالقدوس صہیب نے طلبا اور طالبات کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ: ''یہ بڑا اہم لیکچر تھا اور اسلامی معیشت کے حوالے سے اس میں بہت سے نئے پہلو اور اسلام کے مکمل نظام سے متعلق بحث کی گئی ہے۔ اس لیے شعبۂ اسلامیات کے طلبا کا اس لیکچر کے حوالے سے امتحان ہوگا۔ طلبا اس کی تیاری کریں۔''

حوالہ جات وحواشی

1۔ القرآن 10:7۔ 2۔ عن عائشةؓ، شعب الإيمان للبيهقي. حدیث نمبر:1233، دار الکتب العلمیہ، بیروت۔

3۔ روى البيهقي فى شعب الإيمان. 4۔ ہمعات، از امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ، ہمعہ نمبر17، ص96، طبع: شاہ ولی اللہ اکیڈمی، سندھ۔

5۔ البدور البازغہ، از امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ، ص:55، طبع: شاہ ولی اللہ اکیڈمی، حیدرآباد، سندھ۔ 6۔ القرآن 70:17۔

7۔ القرآن 10:7۔ 8۔ حاشیہ ہدایہ، شیخ الاسلام برہان الدین مرغینانیؒ، کتاب الوصایا، ج:4، ص:666۔

9۔ اسلام کا اقتصادی نظام از حضرت مولانا حفظ الرحمٰن سیوہارویؒ، ص40-39، ادارہ اسلامیات، انارکلی، لاہور۔

10۔ حُجَّةُ اللّٰه البالغه، از امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ، من ابواب ابتغاء الرّزق، ج:2، ص74-273، طبع: مکتبہ حجاز، دیوبند۔

11۔ القرآن 3:83-1۔

12۔ دیکھیے! حواشی ''سماجی انصاف اور اجتماعیت'' از مولانا غلام مصطفیٰ قاسمیؒ ص163 تا168، طبع: رحیمیہ مطبوعات، لاہور، 2019ء۔

13۔ القرآن 70:17۔

14۔ حُجّةُ اللّٰهِ البالِغه، از امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ، باب سياسة المدينة، ج:1، ص141 طبع: مکتبہ حجاز، دیوبند۔

15۔ البدور البازغہ، از امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ، ص:87، طبع: شاہ ولی اللہ اکیڈمی، حیدرآباد۔

16. المعجم الكبير للطّبرانى، عن كعب بن عجرةؓ، كنز العُمّال، از علامه على متقیؒ، حديث نمبر 9206.

17۔ ادب الدنيا و الدّين للإمام ابوالحسن علی بن محمد بن حبیب البصری الماوردیؒ، ص:215، طبع: دار الکتب العلمیہ، بیروت، لبنان۔

18. البدور البازغه، ص: 88. 19۔ سنن الترمذی، حدیث نمبر 1209.

20۔ كتاب الخراج، از امام قاضی ابویوسفؒ، ص45، طبع: بیروت۔

21۔ ایضاً۔ 22۔ ایضاً۔ 23۔ ایضاً، ص50۔ 24۔ القرآن 67:25

25۔ حُجّةُ اللّٰهِ البالِغه، باب سياسة المدينة، ج:1، ص41-140۔

26۔ حُجّةُ اللّٰهِ البالِغه، باب اقامة الارتفاقات و اصلاح الرسوم، ج:1، ص302۔

27۔ ایضاً۔ 28۔ ایضاً، باب سياسة المدينة، ج:1، ص141۔ 29۔ القرآن 45:6۔

30۔ البدور البازغہ، از امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ، ص101۔ 31۔ القرآن 124:20۔

☆

www.rahimia.org

مطالعۂ معاشیات

معاشیات کی اصطلاحات اور معاشی نظاموں کا جائزہ

تحریر: مفتی عبدالخالق آزاد رائے پوری

دینِ اسلام میں معاشیات کی اہمیت

انسانی زندگی میں معاشیات کی اہمیت ہمیشہ سے رہی ہے۔ تمام اقوامِ عالم کے قبائلی رسوم و رواج سے لے کر جدید معاشی قوانین اور ضابطوں اور مذاہب میں معاشی حوالے سے تعلیمات و قوانین بیان ہوتے رہے ہیں۔ آخری کتابِ مقدس قرآن حکیم میں معاشیات کی اہمیت بتلاتے ہوئے اللہ تبارک وتعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے:

وَلَقَدْ مَكَّنّٰكُمْ فِي الْاَرْضِ وَجَعَلْنَا لَكُمْ فِيْهَا مَعَايِشَ ۭ قَلِيْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ ۝۱۰ۧ [1]

(ہم نے زمین میں تمھیں ٹھہرایا اور تمھارے لیے زمین میں زندگی گزارنے کے وسائل اور طریقے پیدا کیے۔ تم بہت کم شکر ادا کرنے والے ہو۔)

مفسرین نے لکھا ہے کہ اس آیتِ مبارکہ میں انسانوں کے لیے دو بنیادی اُمور کا تذکرہ ہے:

1۔ **تمکین فی الارض:** اس کا مطلب انسانوں کا اجتماعی بقا اور عزت و طاقت وقوت کے ساتھ زمین میں قیام پذیر ہونا ہے۔ اس کے لیے زمین میں پہاڑ، دریا وغیرہ رکھے اور تمام انسانوں کو اس سے یکساں طور پر استفادے کا موقع دیا اور ان کے لیے بادلوں کو مسخر کیا، تا کہ ان کے رزق کا بندوبست ہو۔

2۔ **تخلیقِ معائش:** دوسرے یہ کہ تمھارے لیے اس زمین میں معاشی وسائل پیدا کیے، جن سے انسانی احتیاجات کی نہ صرف تسکین ہوتی ہے، بلکہ ان کے ذریعے سے سیاسی، معاشی اور اجتماعی قوت و طاقت بھی وجود میں آتی ہے۔ گویا زمین پر تمھیں قدرت اور طاقت عطا کی اور پھر تمھارے اندر ایسی عقلی اور عملی استعداد رکھی، جن سے تم زمین میں موجود قدرتی وسائل سے استفادہ کرتے ہو اور یوں زندگی گزارنے کے لیے اشیا و خدمات مہیا کرتے ہو۔ معائش ''معیشة'' کی جمع ہے۔ معیشت کا لفظ اُن اشیا پر بھی بولا جاتا ہے، جنھیں انسان استعمال میں لا کر اپنی احتیاجات پوری کرتا ہے اور اُن عقلی اور عملی صلاحیتوں، پیشوں اور وسائل پر بھی بولا جاتا ہے، جن سے اشیا میں افادیت پیدا ہوتی ہے۔ [2]

اس طرح اس آیت میں کہا گیا ہے کہ انسانیت کو زمین پر رہنے کی قدرت و طاقت عطا کی اور دنیا میں زندگی گزارنے کے لیے وسائل معاش اور ان کے حصول کی عقلی اور عملی صلاحیتیں عطا کی ہیں۔ ان نعمتوں کا شکر یہ ہے کہ ان سے بھرپور استفادہ کر کے انسانی زندگی کے لیے آسانیاں پیدا کی جائیں اور اللہ کا شکر ادا کیا جائے۔

ایک اور آیتِ مبارکہ میں ارشادِ خداوندی ہے:

www.rahimia.org

هُوَ الَّذِىْ خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِى الْاَرْضِ جَمِيْعًا [3]

(وہی ہے جس نے پیدا کیا تمھارے واسطے جو کچھ زمین میں ہے۔)

اس آیتِ مبارکہ میں کہا گیا ہے کہ تم تمام انسانوں کے لیے اللہ نے زمین کے تمام قدرتی وسائل پیدا کیے ہیں۔ گویا زمین کے تمام قدرتی وسائل پر تمام انسان محنت کر کے اپنے لیے اشیا و خدمات پیدا کریں اور اس طرح اپنی احتیاجات کی تسکین کریں۔

ایک اور آیتِ مبارکہ میں اللہ تبارک وتعالیٰ کا ارشادِ گرامی ہے:

فَانْتَشِرُوْا فِى الْاَرْضِ وَابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ [4] (زمین میں پھیل جاؤ اور اللہ کا فضل اور رزق تلاش کرو۔)

اس آیت میں وسائل معاش کے حصول کے لیے زمین میں پھیل جانے اور محنت و مشقت کے ذریعے رزق تلاش کرنے کا حکم ہے۔ معاشی سرگرمیوں کے حوالے سے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشادِ گرامی ہے:

''اطلبوا الرّزق من خبايا الأرض.'' [5]

(زمین کے مخفی خزانوں سے (اپنی احتیاجات کے لیے) رزق تلاش کرو۔)

ان آیات اور حدیثِ مبارکہ سے معلوم ہوتا ہے کہ زمین کے تمام قدرتی وسائل سے استفادے کے لیے محنت و مشقت کا راستہ اختیار کیا جائے اور اس کے ذریعے سے اشیا میں ایسی ''افادیت'' پیدا کی جائے، جو انسانی ''احتیاجات'' کو پورا کرنے میں مدومعاون ہو۔ گویا اس حدیث میں اپنی احتیاجات کی تسکین کے لیے نظامِ معیشت استوار کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔

(1) معاشیات کے ابتدائی امور

1.1۔ معاشیات اور اقتصادیات کا لغوی مفہوم

''معاش'' اور ''معیشت'' عربی زبان کا لفظ ہے، جس کا مادہ ''عیش'' ہے۔ اس کے معنی زندہ رہنا، زندگی، خوراک، رزق اور گزران کے ہیں۔ اس طرح ''معیشت'' کا لفظ ایسی اشیا پر بولا جاتا ہے، جس سے انسانوں کی ضروریات پوری ہوتی اور زندگی بسر ہوتی ہے۔ اسی طرح اس لفظ کا استعمال زندگی گزارنے کے اُن طریقوں اور انسانی صلاحیتوں پر بھی ہوتا ہے، جن سے اشیائے ضروریہ حاصل ہوتی ہیں۔

عربی اور فارسی میں اس کے لیے اقتصادیات کی اصطلاح بھی رائج ہے، جس کا مادہ ''قصد'' اور ''اقتصاد'' ہے۔ اس کا مطلب معاملات میں اعتدال اور ''میانہ روی کے ساتھ چلنا'' ہے۔ [6]

معاشیات کو انگریزی زبان میں "Economics" کہتے ہیں، جو ایک لاطینی لفظ OIKO NOMOS سے ماخوذ ہے، جس کا مفہوم گھریلو زندگی گزارنے کے ضابطے کے ہیں۔ ابتدا میں یہ لفظ کے مفہوم کے تحت ایک کنبے کی خوراک، لباس اور رہائش وغیرہ کے انتظام کے لیے استعمال ہوتا تھا۔ بعد میں اِسے ایک شہری ریاست کے امور کے لیے بھی استعمال کیا جانے لگا۔ [7]

1.2۔ معاشیات؛ ایک اجتماعی علم

پہلی بات بنیادی طور پر یہ جاننے کی ہے کہ علم اقتصادیات ایک سماجی علم (Social Science) ہے، یعنی اس علم میں کسی

www.rahimia.org

ایک آدمی کے متعلق مطالعہ نہیں کیا جاتا، بلکہ انسانوں کے متعلق مجموعی حیثیت سے مطالعہ کیا جاتا ہے۔ پھر یہ کہ اس علم میں اُن انسانوں کے متعلق مطالعہ کیا جاتا ہے، جو سماجی اور اجتماعی زندگی بسر کرتے ہیں۔ نہ کہ ان کے متعلق جو دنیا چھوڑ کر سنیاسیوں اور راہبوں کی طرح انفرادی اور مجرد زندگی بسر کرتے ہوں۔ [8]

1.3۔ معاشیات کا دائرۂ کار

سماجی علوم کے کئی شعبے ہیں۔ فلسفہ سماجیات، سیاسیات، معاشیات اور اقتصادیات۔ معاشیات انسانی سماج کے اُن پہلوؤں سے گفتگو کرتا ہے، جو اُس کی معاشی زندگی سے متعلق ہیں۔ اس علم میں سیاسیات، سماجیات اور اس کے فلسفے سے براہِ راست بحث نہیں کی جاتی، بلکہ معاشی حوالے سے انسانی احتیاجات اور ان کی تسکین کے لیے معاشی وسائل کی دستیابی اور اس کو کنٹرول کرنے والے نظام سے متعلق امور زیر بحث آتے ہیں۔

1.4۔ معاشیات کا نفسِ مضمون

معاشیات کے علم میں انسانی زندگی کے دو پہلوؤں سے بحث کی جاتی ہے۔ انسان اس دنیا میں زندگی بسر کرنے کے لیے بہت سی احتیاجات رکھتا ہے۔ اس کی احتیاجات کی تسکین سے ہی دنیا میں انسانی زندگی کا وجود ممکن ہوتا ہے۔ احتیاجات کی تسکین وسائل معاش کے ذریعے سے ہوتی ہے۔ اس لیے علم معاشیات میں انسانی احتیاجات اور ان کی تسکین کے لیے وسائل معاش سے بحث کی جاتی ہے۔ لامحدود خواہشات اور واقعی احتیاجات کے درمیان امتیاز پیدا کرنا ضروری ہوتا ہے۔ اس لیے انسان کی حقیقی اور واقعی احتیاجات کے حوالے سے بھی علم الاقتصاد میں گفتگو کی جاتی ہے۔ اس طرح معاشیات کے مضمون میں انسانی احتیاجات کی تسکین کے لیے وسائل معاش کی پیدائش، ان کی تقسیم، وسائل کے باہمی تبادلے اور ان کے صَرف سے متعلق امور زیر بحث آتے ہیں۔

1.5۔ معاشیات کی تعریف

ماہرین معاشیات نے علم معاشیات کی کئی تعریفیں کی ہیں۔ ان میں سے چند ایک درج ذیل ہیں:

(۱) علامہ ابن خلدون (متوفی 1406ء) نے معاشیات کی تعریف یہ کی ہے:

''إنّ المعاش هو عبارة من ابتغاء الرّزق و السعى فى تحصيله.'' [9]

(معاشیات ایک ایسا علم ہے کہ جس میں وسائل رزق تلاش کیے جاتے ہیں۔ اور ان کے حصول کے لیے محنت اور کوشش کی جاتی ہے۔)

(۲) حضرت الامام شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے ۱۱۴۷ھ/ 1734ء میں اپنی کتاب ''**البدور البازغه**'' اور ''**حجة الله البالغه**'' میں علم معاشیات کی بڑی جامع تعریف درجِ ذیل الفاظ میں کی ہے:

''الحكمة المعاشية: ان تستوفى حوائجك علىٰ مراعاة الأخلاق الفاضلة و مقتضى العلوم التجربية و الرأى الكلّى.'' [10]

(معاشیات ایک ایسا علم ہے، جس میں انسانی فطرت کے بنیادی اخلاق، دور کے تجرباتی علوم، اجتماعی مفاد کے

www.rahimia.org

تقاضوں کو سامنے رکھتے ہوئے انسانی احتیاجات کی تعیین اور ان کی تسکین کے لیے وسائل معیشت کے حصول سے بحث کی جاتی ہے۔)

اس تعریف کے مطابق انسانی زندگی کی حاجات کی نوعیت اور حیثیت متعین کرنے کے لیے بھی تین بنیادی امور کو پیش نظر رکھا جائے گا:

1۔ ایک یہ کہ انسانی احتیاجات کی تعیین میں بنیادی اقدار و اخلاق کی رعایت رکھی جائے۔

2۔ دوسرے یہ کہ ہر دور کی ٹیکنالوجی اور تجرباتی علوم کے تقاضوں کو سامنے رکھا جائے۔

3۔ تیسرے یہ کہ ان حاجات کا پورا کرنا اجتماعی مفادِ عامہ کے نقطہ نگاہ سے بھی درست ہو۔

اسی طرح ان حاجات کی تسکین کے لیے حاصل کیے گئے وسائل معاش کی پیدائش، تقسیم، تبادلہ اور صَرف میں بھی انھی تینوں بنیادی اصولوں کو سامنے رکھا جائے گا۔

(۳) سرمایہ داری نظام کے بانی ایڈم سمتھ نے 1776ء میں اپنی کتاب ''دولت ِاقوام'' میں لکھا: اقتصادیات (Economics) وہ علم ہے، جو انسان کی زندگی کے اس پہلو سے بحث کرتا ہے، جس کا تعلق ''دولت'' سے ہے۔ چناں چہ اس نے اپنی کتاب میں ''دولت'' کے چار پہلوؤں؛ ''پیدائش''، ''تقسیم''، ''تبادلہ'' اور ''صَرف'' کے انسانی زندگی کے ساتھ تعلق سے بحث کی ہے۔ سرمایہ دارانہ نقطہ نگاہ سے ان چاروں حوالے سے فردِ واحد یا سرمایہ دار طبقہ کردار ادا کرتا ہے۔ [11]

(۴) سوشلزم کے نزدیک معاشیات ایک ایسا علم ہے، جس میں انسانی محنت کی اساس پر سماجی اور اجتماعی حوالے سے دولت کی پیدائش، تقسیم، تبادلہ اور صَرف کے عمل پر بحث کی جاتی ہے۔ ان کے نزدیک ان چاروں دائروں میں انفرادی نقطہ نگاہ سے بحث نہیں کی جاتی۔

1.6۔ معاشیات کا موضوع

اس علم کا موضوع انسان کی معاشی زندگی کی احتیاجات اور اس سے متعلق وہ وسائل معیشت اور ''دولت'' ہے، جس کے عوارضِ ذاتیہ یعنی ''پیدائش دولت'' اور ''صَرفِ دولت'' وغیرہ کے بارے میں گفتگو اور بحث کی جاتی ہے۔

1.7۔ معاشیات کی غرض و غایت اور مقصد

اقتصادیات کے مطالعے کا مقصد یہ ہے کہ اشیا (Goods) اور خدمات (Services) کے ذریعے انسان کی بے شمار حاجات اور ضروریات کو پورا کرنے کے متعلق علم حاصل کیا جائے۔ اس لیے ضروری ہے کہ انسانوں کی حاجات کی بابت کچھ علم ہونا چاہیے اور دولت اور قدرتی وسائل (Natural Resources) کے متعلق کچھ معلومات ہونی چاہئیں۔ ان سب کو مدنظر رکھتے ہوئے خدا کی عطا کی ہوئی نعمتوں کو انسانی بہتری اور فلاح و بہبود کے لیے کیسے استعمال کیا جائے۔ یعنی انسانوں کو حتیٰ المقدور بھوک اور تکالیف سے آزاد کرایا جائے۔ اور ان کی حاجات اور ضروریات کو پورا کیا جائے، تاکہ وہ خوش حال ہوسکیں۔ [12] اس طرح خدا کے بندے امن و سکون کی زندگی بسر کرتے ہوئے خدا کی نعمتوں کا شکریہ ادا کریں اور اس کی یاد سے غافل نہ ہوں۔

www.rahimia.org

(2) معاشیات کی چند بنیادی اصطلاحات

اقتصادیات کی تعریف، موضوع اور غرض و غایت کے بعد اس علم کی چند بنیادی اصطلاحات کا جاننا بھی ضروری ہے۔ یوں تو اس علم کی اصطلاحات بہت ہیں، لیکن ہم یہاں پر صرف ان اصطلاحات کا تذکرہ کریں گے، جو بنیادی حیثیت رکھتی ہیں۔ اور یوں معاشیات سے متعلق ہونے والی بحث و گفتگو میں بیان کیے جانے والے الفاظ کے وہ معنی مراد نہ لیے جائیں، جو عام طور پر سمجھے جاتے ہیں، بلکہ ان کے اصطلاحی مفاہیم ہی مراد لیے جائیں۔ تاکہ بحث و گفتگو اپنے منطقی انداز میں سمجھ میں آجائے۔ اور پھر بعض اصطلاحات اس قسم کی ہیں کہ مختلف زاویہ ہائے فکر رکھنے والے ماہرین کے ہاں ان کے مختلف مفاہیم پیشِ نظر رہے ہیں۔ اس لیے ان کا لحاظ کرنا بھی ضروری ہے۔ ہماری پوری کوشش ہوگی کہ ہر اصطلاح کا پورا پورا مفہوم ان نظاموں کے متعلق ماہرین کی روشنی میں بیان کریں۔

2.1۔ حاجات (Wants)

انسانی جسم کی وہ حالت، جب کہ انسان کسی شئے کا محتاج ہوتا ہے، پھر اس شئے کے حاصل ہونے پر اسے تسکین اور راحت ملے، اسے حاجت کہا جاتا ہے۔ امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے نزدیک انسان کی حاجات کے تعین کے لیے انسانیت کی مسلمہ اقدار و اَخلاق، دور کے تجرباتی علوم اور اجتماعی مفادِ عامہ کو پیشِ نظر رکھنا ضروری ہے۔ چناں چہ اسی تناظر میں معاشی حاجات کا تعین کیا جانا چاہیے۔

انسان کی معاشی حاجات کی تین قسمیں ہیں:

i۔ ضروریات (Necessities): یہ وہ احتیاجات ہیں، جو انسان کی زندگی کے لیے اشد ضروری ہیں۔ مثلاً کھانا، کپڑا اور گھر وغیرہ۔ ان احتیاجات کو پورا کیے بغیر انسان کی زندگی بسر نہیں ہوسکتی۔

ii۔ آسائشات (Comforts): یہ وہ حاجات ہیں، جن کے پورا ہونے سے انسان آسانی اور سہولت سے زندگی بسر کرسکے۔ ان احتیاجات کو پورا کرنے سے انسان کی کارکردگی میں اضافہ ہوجاتا ہے۔

ii۔ تعیّشات (Luxuries): یہ وہ ہیں جو انسان کے لیے خاص طور پر تو ضروری نہیں ہیں، لیکن جن کے استعمال سے انسان عیش کے ساتھ زندگی گزارتا ہے۔ تعیّشات کے استعمال سے انسان کی کارکردگی میں کوئی اضافہ نہیں ہوتا۔

امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے نقطہ نظر سے انسانیت کے بنیادی اَقدار و اَخلاق، انسانی زندگی کے تجربات اور اجتماعی مفادِ عامہ کی رُو سے انسانی حاجات کی تسکین کے لیے ''رفاہیتِ متوسطہ'' یعنی آسائشات کو پیشِ نظر رکھنا ضروری ہے۔

2.2۔ اشیا و خدمات (Goods and Services)

علم معاشیات میں ''اشیا'' وہ ہیں، جو انسان کی کسی نہ کسی حاجت کو پورا کریں۔ اگر وہ مادی ہوں تو ''اشیا'' (Goods) کہلاتی ہیں اور اگر غیر مادی ہوں جیسے انسان کی ذہنی و عقلی اور جسمانی خدمات، تو انھیں ''خدمات'' (Services) کے الگ لفظ سے ممتاز کیا جاتا ہے۔ ویسے ''اشیا'' کا لفظ دونوں پر بھی بولا جاسکتا ہے۔[13]

www.rahimia.org

اشیا کی دو قسمیں ہیں:

[1] مفت اشیا (Free Goods): یہ وہ قدرتی اشیا ہیں، جو بغیر کسی محنت اور معاوضے کے حاصل ہوجاتی ہیں۔ مثلاً ہوا، سورج کی روشنی وغیرہ۔ (14) ان سے بغیر کسی عوض کے ''افادہ'' حاصل ہوتا ہے۔

[2] معاشی اشیا (Economic Goods): ایسی اشیا جنھیں انسان بذریعہ محنت حاصل کرتا ہے۔ (15) پھر انھیں حاصل کرنے کے لیے دوسرے انسان کو معاوضہ ادا کرنا پڑتا ہے۔ (16) ان کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ انھیں ایک شخص سے دوسرے کے پاس منتقل کیا جاسکتا ہے، یا ان کا افادہ واستعمال منتقل ہوسکتا ہے۔

سرمایہ داری ذہن رکھنے والے ماہرینِ معاشیات ''محدود'' ہونا بھی ''معاشی اشیا'' کے اوصاف میں سے بیان کرتے ہیں۔ نیز وہ ''مفت اشیا'' کے ساتھ بھی – لامحدود – وصف کا اضافہ کردیتے ہیں۔ (17) اس طرح وہ زمین اور قدرتی وسائل کو ''مفت اشیا'' کے زمرے سے خارج کردیتے ہیں اور زمین وغیرہ کو محدود قرار دے کر ''معاشی اشیا'' میں داخل کرتے ہیں۔ اور انھیں ''قانونِ طلب و رسد'' کے تابع کردیتے ہیں۔ لیکن دوسرے ماہرینِ معاشیات اس قید اور وصف کا اضافہ نہیں کرتے، بلکہ ان کے نزدیک ہر چیز جب قدرتی اور فطری حالت میں ہوتی ہے تو وہ ''مفت اشیا'' میں داخل ہے۔ خواہ وہ کائنات میں محدود تعداد میں ہو یا لامحدود ہو۔

سرمایہ داری نظام کے حامی ماہرینِ معاشیات کا یہ نظریہ کہ ''انسانی حاجات لامحدود ہیں'' اور بعض قدرتی وسائل انسانی ضروریات کے مقابلے میں محدود ہوتے ہیں۔'' (18) دینی نقطہ نگاہ سے درست نہیں ہے۔ اس لیے کہ جہاں تک ''انسانی ضروریات'' کا تعلق ہے، ان کے پورا کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے قدرتی وسائل بڑی وافر مقدار میں پیدا کیے ہیں۔

چناں چہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے کہ:

''وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْاَرْضِ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا'' (19)

(کوئی جان دار روئے زمین پر ایسا نہیں، مگر یہ کہ اس کی روزی اللہ تعالیٰ کے ذمے ہے۔)

ظاہر ہے کہ اس رزق کو قدرتی وسائل کی صورت میں ہی اللہ تعالیٰ نے پیدا فرمایا ہے۔ ان سے انسان کی ''ضروریات'' بہ خوبی پوری ہوجاتی ہیں، لیکن جہاں تک انسان کی خواہشات کا تعلق ہے، تو پھر ایک انسان کی خواہشات ہی اتنی ہوجائیں گی کہ پوری کائنات بھی اس کے سامنے محدود ہوگی۔

اس تناظر میں دین اسلام کے نقطہ نگاہ سے بھی ''مفت اشیا'' کے ساتھ ''لامحدود'' کی قید لگانا درست نہیں ہے۔ اس لیے کہ کوئی شئے جب تک قدرتی حالت میں ہوتی ہے، وہ کسی کی ملکیت نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کا مالک ہے اور اس نے بغیر کسی معاوضے کے ہر انسان کو یکساں طور پر اپنی اپنی استعداد کے موافق اُس سے فائدہ اٹھانے کا اختیار دیا ہے، لیکن جب کوئی شخص محنت و مشقت برداشت کرکے اُس شئے کو اپنے قبضے میں لے آتا ہے تو پھر بہ طور تصرف اور نفع کے اس کی ملکیت شروع ہوتی ہے۔ تب ہی معاوضے اور تبادلے کا عمل شروع ہوتا ہے۔

دراصل سرمایہ دارانہ نظامِ معیشت میں اشیا کے محدود اور کم یابی پر جو اتنا زور دیا جاتا ہے، اس کی اصل حقیقت یہ ہے کہ یہ لوگ اس طرح طلب و رسد کے قانون کو ذخیرہ اندوزی کے ذریعے سے من مانے مقاصد کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ اشیا کی

www.rahimia.org

کم یابی اور محدود ہونے کا زیادہ تر مدار سرمایہ داروں کی ذخیرہ اندوزی پر ہوتا ہے، یا صحیح منصوبہ بندی نہ ہونے کی وَجہ سے قدرتی وسائل سے بھرپور استفادہ نہیں کیا جاتا۔ جو یقیناً نظامِ حکومت کی کوتاہی کا نتیجہ ہوتا ہے۔

2.3۔ معاشی اشیا کی اقسام

معاشی اشیا کی دو قسمیں ہیں:

i۔ اشیائے صَرف (Consumer's Goods): ایسی تمام اشیا' اشیائے صَرف کہلاتی ہیں، جن کے استعمال سے براہِ راست تسکین حاصل ہوتی ہے۔ معلم، ڈاکٹر اور حجام وغیرہ کی خدمات کے علاوہ روٹی، قلم، کتاب، ریڈیو، سائیکل وغیرہ چیزیں بھی اس میں شامل ہیں۔

ii۔ اشیائے سرمایہ (Capital Goods): یہ اشیا براہِ راست انسانی ضروریات کو پورا نہیں کرتیں، بلکہ مزید اشیا ''پیدا'' کرنے یا ''آمدنی'' کے حصول میں مدد دیتی ہیں۔ مثلاً خام مال جیسے دھاتیں، کپاس، کھالیں یا نیم تیار شدہ مال جیسے سوت، کیمیاوی مرکبات یا مکمل اشیا جیسے مشینیں، اوزار، آلات وغیرہ۔[20]

2.4۔ دولت (Wealth) / سرمایہ (Capital)

عام بول چال میں روپیہ پیسہ یا زمین و جائیداد کو ''دولت'' کہا جاتا ہے، لیکن معاشیات میں ''دولت'' سے مراد ''معاشی اشیا'' ہیں۔

سرمایہ داروں کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ اگر ''معاشی اشیا'' ذاتی صَرف اور استعمال کے لیے رکھ لی جائیں تو ''دولت'' ہیں اور اگر مزید اشیا پیدا کرنے کے لیے گردش میں لائی جائیں تو ''سرمایہ'' ہیں، لیکن سوشلسٹوں کے نزدیک ''دولت'' ہر حال میں ''صَرف'' ہوتی ہے۔ خواہ براہِ راست استعمال میں لا کر صَرف کرلیا جائے اور اپنی کسی حاجت کی تسکین کر لی جائے یا ''انسانی محنت'' اور دولت کو ''صَرف'' کر کے کسی چیز میں مزید ''افادہ'' پیدا کرنے کے لیے استعمال میں لایا جائے۔ ان کے ہاں ''سرمایہ''، ''قدرِ زائد'' ہے، جو ''منجمد محنت'' یا ''انسانی سماجی محنت'' ہے۔ اور وہی مزید اشیا پیدا کرتی ہے۔ اس سے متعلقہ پوری بحث لفظ ''سرمایہ'' کی تشریح میں آئندہ بیان ہوگی۔

2.5۔ افادہ (Utility)

عام طور پر ''افادہ'' کا لفظ فائدہ کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے، لیکن معاشیات میں اس کا مفہوم کچھ مختلف ہے۔ کسی شئے میں انسانی ضروریات کو پورا کرنے کی جو صلاحیت پائی جاتی ہے، معاشیات میں اسے ''افادہ'' کہتے ہیں۔ مثلاً روٹی ہماری بھوک مٹاتی ہے اور پانی پیاس بجھاتا ہے وغیرہ وغیرہ۔[21]

افادہ کی دو قسمیں ہیں:

i۔ قدرتی افادیت (Natural Utility): یعنی خدا تعالیٰ کی طرف سے پیدا شدہ کسی شئے کی وہ صلاحیت، جسے انسان اپنے استعمال میں لاتا ہے، اس میں وہ تمام قدرتی وسائل اور خام مواد شامل ہے، جو ابھی فطرتی اور قدرتی حالت میں ہیں۔ مثلاً دریاؤں کا پانی، جنگلات کی لکڑی، زمین میں دبی معدنیات وغیرہ۔

www.rahimia.org

ii۔ **تخلیقی افادیت**(Productive Utility): یعنی قدرتی اشیا میں انسانی محنت اپنی قوت و توانائی ''صَرف'' کر کے ایسی مزید صلاحیت پیدا کر دے کہ جس سے انسان کو ''افادہ'' حاصل ہو۔ مثلاً لکڑی کو فرنیچر کی شکل دینا وغیرہ۔

پھر تخلیقی افادیت کی چند قسمیں ہیں:

i۔ **افادۂ حفاظت** (Security Utility): ایک شئے کی آپ ایک خاص مدت تک حفاظت کرتے ہیں اور اس پر آپ کی محنت صَرف ہوتی ہے تو اس طرح بھی شئے میں ''افادہ'' پیدا ہوتا ہے۔ اِسے ''افادۂ حفاظت'' کہا جاتا ہے۔ مثلاً ایک کاشت کار فصلوں کی پیداوار اٹھانے کے لیے محنت بھی کرتا ہے اور ایک خاص مدت تک اس کی حفاظت بھی کرتا ہے۔ جب کہ فصل کی نشو ونما میں ذاتی طور پر اس کا کردار نہیں ہوتا۔ اس افادہ کا تعلق ابتدائی طور پر شعبۂ زراعت سے ہے۔ اور ثانوی طور پر مصنوعات اور تجارتی اشیا کے تحفظ کے لیے ہونے والی جدوجہد اور محنت بھی ''افادۂ حفاظت'' کی ایک نوعیت ہے۔

ii۔ **افادۂ شکل** (Form Utility): محنت صَرف کر کے کسی شئے کی شکل وصورت تبدیل کرنے سے بھی ''افادیت'' پیدا ہوجاتی ہے۔ اِسے ''افادۂ شکل'' کہا جاتا ہے۔ مثلاً لکڑی کی شکل تبدیل کر کے فرنیچر تیار کرنے سے لکڑی میں ایک نئی افادیت پیدا ہوگئی۔ عام طور پر کسی شئے میں یہ 'افادیت' صنعت وحرفت کے ذریعے سے پیدا کی جاتی ہے۔

ii۔ **افادۂ مقام** (Place Utility): محنت سے کسی چیز کی جگہ تبدیل کر دینے سے بھی افادہ پیدا کیا جاسکتا ہے۔ دریا کے کنارے پڑی ریت جب شہر میں منتقل کر دی تو اس میں افادیت پیدا ہوگئی۔ اسے ''افادۂ مقام'' کہا جاتا ہے۔ تاجر ایک شہر کی مصنوعہ چیز کو دوسرے شہر لے جائے تو اس طرح وہاں کے لوگوں کے لیے اس شئے میں افادیت پیدا ہوجاتی ہے۔ کسی شئے میں یہ 'افادیت' عام طور پر تبادلہ اشیا اور تجارت کے ذریعے سے پیدا ہوتی ہے۔

2.6۔ قانون تقلیل افادہ (Law of Diminishing Utility)

انسانی احتیاجات اور انھیں پورا کرنے والی اشیا میں موجود ''افادیت'' کے باہمی تعلق کو سمجھنے کے لیے معاشیات کا ایک اہم قانون ''قانونِ تقلیل افادہ'' ہے۔ جب ہم اپنی کسی حاجت کو پورا کرنے کے لیے کوئی شئے صَرف کرتے ہیں تو چھوٹی چھوٹی اکائیوں میں اِسے خرچ کرتے ہیں۔ تمام اکائیوں کو بیک وقت اکٹھے ہی استعمال نہیں کرتے۔ اب جیسے جیسے کسی شئے کی مختلف اکائیوں کو الگ الگ استعمال کرتے رہیں گے، ویسے ویسے ان کے صَرف کی حاجت کم ہوتی چلی جائے گی۔ یوں اس خاص وقت میں اُس شئے سے حاصل ہونے والا افادہ کم ہوتا چلا جائے گا۔ مثلاً اگر کوئی انسان بھوک مٹانے کے لیے بریڈ کا استعمال کرتا ہے تو انھیں الگ الگ اکائیوں کی شکل میں استعمال کیا جاتا ہے۔ پھر جیسے جیسے ایک سلائس پر دوسرا سلائس کھاتے جائیں گے تو ان کا افادہ کم ہوتا جائے گا۔ حتیٰ کہ ایک درجے پر جا کر ''افادہ صفر'' ہوجائے گا، بلکہ مزید کھانے سے ''افادہ منفی'' شروع ہوجائے گا۔

اس قانون کو سمجھنے کے لیے درجِ ذیل اصطلاحات کا ذکر ضروری ہے:

i۔ **ابتدائی افادہ**(Initial Utility): کسی شئے کی پہلی اکائی کا استعمال کرنے سے جو افادہ حاصل ہوتا ہے، اسے ''ابتدائی افادہ'' کہا جاتا ہے۔ مثلاً ڈبل روٹی کھاتے وقت پہلے سلائس کا افادہ ''ابتدائی افادہ'' ہے۔

ii۔ **مختتم افادہ**(Marginal Utility): اس سے مراد کسی شئے کی ہر اگلی اکائی سے حاصل ہونے والا افادہ ہے۔ مثلاً پہلے سلائس

www.rahimia.org

کا افادہ اگر 10 درجے ہے تو دوسرے سلائس کا 8 درجہ اور تیسرے کا 6 درجہ وغیرہ۔

iii۔ **کل افادہ**(Total Utility): وہ افادہ جو کسی شیئ کی تمام اکائیوں سے مجموعی طور پر حاصل ہو۔ مثلاً ایک آدمی نے 3 سلائس کھائے تو ان کا مجموعی افادہ ''کل افادہ'' کہلائے گا۔

iv۔ **مثبت افادہ**(Positive Utility): جب کسی شیئ کی اکائیوں کے استعمال سے تسکین اور راحت ملتی رہے تو یہ ''افادہ مثبت'' کہلاتا ہے۔

v۔ **صفر افادہ** (Zero Utility): افادہ صفر اس وقت ہوتا ہے، جب کوئی حاجت مکمل طور پر پوری ہوجائے اور شیئ کو مزید صَرف کرنے کی حاجت باقی نہ رہے۔

vi۔ **منفی افادہ**(Negative Utility): اگر حاجت پوری ہونے کے بعد بھی کوئی شیئ صرف کی جائے تو وہ تسکین دینے کے بجائے الٹا نقصان دیتی ہے۔ اسے ''منفی افادہ'' کہا جاتا ہے۔

افادے کی ان حالتوں کو درجِ ذیل نقشے سے بخوبی سمجھا جاسکتا ہے۔ فرض کیا کہ آپ سلائس کھا رہے ہیں اور سلائس کی ہر اکائی سے حاصل ہونے والا ''افادہ'' درجِ ذیل چارٹ کی صورت میں سامنے آتا ہے:

بریڈ کی اکائیاں	زائد اکائی سے حاصل شدہ افادہ (افادہ مختتم)	کل افادہ
1	(مثبت افادہ) 10 یونٹ	10
2	(مثبت افادہ) 8 یونٹ	18 = 8+10
3	(مثبت افادہ) 5 یونٹ	23 = 5+18
4	(مثبت افادہ) 2 یونٹ	25 = 2+23
5	صفر	25 = 0+25
6	(منفی افادہ) -2 یونٹ	23 = 2-25
7	(منفی افادہ) -5 یونٹ	18 = 5-23

پہلے سلائس سے حاصل ہونے والا افادہ 10 ہے۔ یہ ''ابتدائی افادہ'' ہے؛ اگر صارف 4 سلائسز استعمال کر کے کھانا ختم کر دیتا ہے تو چوتھی اکائی سے حاصل ہونے والا افادہ "2" اس کا ''افادۂ مختتم'' ہوگا، اور اس کا ''کل افادہ'' 25=(2+5+8+10) ہوگا۔ ہم دیکھتے ہیں کہ جوں جوں صارف سلائس کی زیادہ اکائیاں استعمال کرتا جاتا ہے، ہر بعد میں آنے والی اکائی کا افادہ پہلے استعمال شدہ اکائی کی نسبت سے کم ہوجاتا ہے۔ مگر مجموعی افادہ بڑھتا رہتا ہے۔ اب 4 سلائسز کا ''افادہ مثبت'' رہا۔ پانچویں سلائس پر ''افادہ صفر'' ہوگیا۔ یعنی گزشتہ مجموعی افادہ پر کوئی زیادتی نہیں ہوئی۔ چھٹے سلائس استعمال کرنے سے افادہ کے بجائے اُلٹا نقصان ہوا۔ یعنی ''منفی افادہ'' حاصل ہوگا اور اس طرح کل افادہ بھی کم ہوجائے گا۔ قانونِ تقلیل افادہ کی معاشیات میں بڑی اہمیت ہے۔ اس قانون سے معاشیات کے بہت سے اہم مسائل حل کیے جاتے ہیں۔

www.rahimia.org

2.7۔ پیدائشِ دولت (Production of Wealth)

دنیا میں قدرتی وسائل اور مادہ (Matter) روزِ ازل سے موجود ہے۔ اسے اللہ تعالیٰ نے پیدا کیا ہے۔ اسے کم یا زیادہ کرنا یا تخلیق کرنا کسی انسان کے لیے ناممکن ہے۔ البتہ انسان اس کا تحفظ، شکل اور مقام وغیرہ تبدیل کر کے اس میں ''افادیت'' کی تینوں اقسام میں سے کوئی سا ''افادہ'' پیدا کر سکتا ہے، جسے صَرف کر کے انسان اپنی کسی حاجت کو پورا کر سکے۔ کسی شئے میں یہی افادۂ تحفظ، افادۂ شکل یا افادۂ مقام پیدا کرنے کو معاشیات میں ''پیدائش'' کہا جاتا ہے۔ قدرتی یا پیدا شدہ وسائل میں عملِ پیدائش کے ذریعے ''دولت'' وجود میں آتی ہے۔

2.8۔ عاملینِ پیدائشِ دولت (Factor of Production)

دولت کی پیدائش کے عاملین وہ کہلاتے ہیں، جو قدرتی وسائل میں ''افادیت'' یا ''سرمایہ'' میں مزید افادیت پیدا کرنے کے لیے کردار ادا کرتے ہیں۔ عاملینِ پیدائش دولت کا تعین اس لیے کیا جاتا ہے تا کہ تقسیم دولت کا عمل انھی کے مطابق ہو۔

معاشیات کے مختلف نظریات کے تناظر میں زیادہ سے زیادہ عاملین پیدائش دولت چار ہو سکتے ہیں:

i۔ زمین (Land) ii۔ محنت (Labour) iii۔ سرمایہ (Capital) iv۔ تنظیم (Orgnization)

i۔ زمین (Land)

معاشیات میں ''زمین'' محض سطحِ ارض کا نام نہیں ہے، بلکہ معاشی اصطلاح میں ''زمین'' سے مراد وہ تمام قدرتی وسائل اور اشیا ہیں، جو پیدائش دولت کے عمل میں قدرتی مادہ کی حیثیت سے استعمال ہوتے ہیں۔ چناں چہ سطح زمین اور اس کے نیچے پائی جانے والی تمام معدنیات، دریا، جنگلات وغیرہ ''زمین'' کی تعریف میں داخل ہیں۔ اسی طرح فضا میں پائی جانے والی قدرتی اشیا؛ ہوا، سورج کی روشنی، بارش وغیرہ بھی ''زمین'' کی تعریف میں داخل ہیں۔ غرض یہ کہ تمام قدرتی وسائل، جب کہ ان میں کوئی عملِ محنت نہ کیا گیا ہو، زمین ہے۔

سرمایہ دارانہ نقطہ نگاہ سے ''زمین'' سرمائے سے الگ عامل پیدائش دولت ہے۔ اسی لیے جاگیردارانہ اور سرمایہ دارانہ نظام میں تقسیم دولت کے وقت اس کا الگ حصہ ''لگان'' کی صورت میں وصول کیا جاتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ ''زمین'' پر مبنی قدرتی اشیا اپنی ابتدائی حالت میں کسی خاص فرد کی ملکیت نہیں، بلکہ تمام انسانوں کے لیے مشترکہ طور پر مباح ہیں۔ ملکیت اور اس پر لگان وصول کرنے کا معاملہ اُس وقت زیر بحث ہوگا، جب زمین پر انسانی محنت کا عمل دخل ہوتا ہے۔ سرمایہ دارانہ نقطہ نظر سے وہ قدرتی وسائل جن میں انسانی محنت کے ذریعے سے افادیت پیدا کی جائے اور اُسے مزید پیدائش کے لیے استعمال میں لایا جائے ''سرمایہ'' کے دائرے میں داخل ہیں۔ اس لیے بعض مفکرین کے نزدیک یہ الگ عامل پیدائش دولت نہیں، بلکہ ''سرمایہ'' کا حصہ ہے۔[20]

ii۔ محنت (Labour)

معاشیات میں محنت سے مراد انسان کی وہ تمام ذہنی یا جسمانی قابلیتیں اور صلاحیتیں ہیں، جنھیں صَرف کر کے وہ کسی ''شئے''

www.rahimia.org

میں ''افادیت'' پیدا کرتا ہے۔ انسانی محنت اشیا کے تحفظ، شکل وصورت یا مقام کی تبدیلی کی صورت میں ہوتی ہے، جس سے ان میں افادیت پیدا ہوتی ہے۔ اس طرح انسانی محنت پیدائش دولت کے عمل میں بنیادی کردار ادا کرتی ہے۔ اور پھر یہ عمل دنیا میں کسی ایسے معاوضے کے لیے ہو، جس سے اس کی کوئی حاجت پوری ہوتی ہو۔ گویا ''محنت'' کی تعریف میں تین چیزوں کا لحاظ ضروری ہے:

الف: انسان کی دماغی یا جسمانی محنت مراد ہے، حیوان کی محنت نہیں۔

ب: شئے میں افادہ (تحفظ، شکل وصورت یا مکان کی تبدیلی) کا پیدا ہونا۔

ج: محنت کا مقصد کسی مادی یا مالی معاوضے کا حصول ہو۔

ورزش، کھیل کود اور لغو وفضول کاموں کی محنت ومشقت ''معاشی محنت'' میں شامل نہیں۔

''محنت'' تمام معاشی نظریات میں بنیادی عامل پیدائش دولت کی حیثیت رکھتی ہے۔ کیوں کہ عمل پیدائش اس وقت تک ممکن نہیں، جب تک کہ انسانی محنت کسی نہ کسی شکل میں اس میں شامل نہ ہو۔

پھر سرمایہ دارانہ نقطہ نظر کے ماہرین معاشیات ''مشین'' وغیرہ کے کام کو ''سرمایہ'' قرار دیتے ہیں، اُسے ''محنت'' قرار نہیں دیتے ہیں۔

جب کہ کارل مارکس (Karl Marks) نے ''انسانی محنت'' کی دو قسمیں کی ہیں:

الف: جان دار محنت: انسان کی وہ محنت جو وہ کام کے وقت خرچ کر رہا ہے اور شئے میں مزید افادیت پیدا کر رہا ہے ''جان دار محنت'' کہلاتی ہے۔

ب: بے جان محنت یا مُجسّم محنت: یعنی انسان کی وہ محنت جسے کسی شئے کی تیاری پر خرچ کی جا چکی ہے۔ اور اس کی وجہ سے شئے میں ''قدر'' پیدا ہوگئی ہے۔ جیسے مشین اور دولت (جسے مزید دولت پیدا کرنے کے لیے پھر صَرف کیا جائے) دراصل ''مجسّم محنت'' ہیں۔ چناں چہ مارکس ایک جگہ لکھتا ہے:

''سماجی محنت کی متجسّم مقدار جنس (دولت)... میں اوّل سے آخر تک رہتی ہے۔''[23]

iii۔ سرمایہ (Capital)

سرمایہ دارانہ نقطہ نظر سے اس کا مصداق وہ تمام اموال ہیں، جو ''زمین'' میں ''انسانی محنت'' سے وجود میں آتے ہیں اور جن سے مزید دولت کمانے کے لیے زراعت، صنعت اور تجارت کے فروغ میں مدد لی جاتی ہے۔ بالفاظِ دیگر مصنوعات مشین اور نقد زر کی صورت میں ایسی تمام اشیا ''سرمایہ'' (Capital) کے ذیل میں آتی ہیں، جو مختلف قسم کے کاروبار میں استعمال ہوتی ہیں اور اگر کاروبار میں استعمال نہ کیا جائے، بلکہ ذاتی صرف کے لیے رکھ لیا جائے تو اسے ''دولت'' (Wealth) کہا جاتا ہے۔

جب کہ سوشلسٹ نقطہ نظر سے کیپٹل دراصل ''مُنجمِد انسانی محنت'' کا دوسرا نام ہے۔

iv۔ تنظیم (Orgnizaition)

سرمایہ دارانہ نقطہ نظر سے معاشیات میں اس کا مطلب وہ تنظیم اور منصوبہ بندی ہے، جو ایک ماہرِ فن اور مالک مذکورہ عناصر

www.rahimia.org

(یعنی زمین، محنت اور سرمایہ) سے فائدہ اٹھانے کے لیے تجویز کرتا ہے۔ یعنی زمین، محنت اور سرمائے کو ملا کر وہ جو پلاننگ کرتا اور نفع نقصان کا ذمہ دار بنتا ہے، اُسے تنظیم کہا جاتا ہے۔

عام طور پر سرمایہ دارانہ نقطہ نظر رکھنے والے مفکرین کے ہاں پیدائش دولت کے یہ چار عاملین ہیں۔ بعض مفکرین نے یہ تسلیم کیا ہے کہ عقلی طور پر ''زمین'' سرمائے میں شامل ہے۔ جب کہ ''تنظیم''، ''محنت میں شامل ہے کہ یہ ذہنی محنت ہے۔ اس طرح اصل دو عامل پیدائش دولت سرمایہ اور محنت رہ جاتے ہیں۔ (24)

2.9۔ تقسیم دولت (Distribution of Wealth)

معاشیات میں تقسیم دولت سے مراد یہ ہے کہ دولت کی پیدائش کرنے والے عاملین میں پیدا شدہ دولت کی تقسیم کی جائے۔

سرمایہ دارانہ ماہرین معاشیات کے نزدیک چوں کہ پیدائش دولت کے عاملین چار ہیں:

i۔ زمین ii۔ محنت iii۔ سرمایہ iv۔ تنظیم

ان کے نزدیک پیداوار کو ان چار عاملین پیدائش دولت کے درمیان ایک خاص تناسب کے ساتھ تقسیم ہونا چاہیے۔

(الف) ''لگان'' (Rent): یعنی پیداوار کا ایک حصہ زمین کے معاوضے کے طور پر لیا جاتا ہے۔

(ب) ''اُجرت'' (Wage): پیداوار کا دوسرا حصہ محنت کا ہوتا ہے۔ اسے ''اُجرت'' کہا جاتا ہے۔

(ج) ''سود'' (Interest): پیداوار کا تیسرا حصہ سرمائے کا ہوتا ہے، جسے ''سود'' کہا جاتا ہے۔

(د) ''منافع'' (Profit): پیداوار کا چوتھا حصہ آرگنائزر یا آجر کا ہوتا ہے، جسے منافع کا نام دیا جاتا ہے۔

سرمایہ دارانہ نظام میں ان چاروں کے حصص میں طلب و رسد کی بنیاد پر کمی بیشی ہوسکتی ہے۔ جب کہ اگر دو عامل پیدائش ''سرمایہ'' اور ''محنت'' قرار دیے جائیں تو ''سرمایہ'' کا معاوضہ ''لگان اور سود'' ہوگا۔ اور محنت کا معاوضہ ''اجرت'' اور ''منافع'' ہوگا۔

سرمایہ دارانہ نظام میں عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ ''سرمائے'' کے مقابلے پر ''محنت'' کی سوداکاری (bargaining) کی قوت کم ہوتی ہے۔ اس لیے پیداوار کا زیادہ تر حصہ سرمایہ دار منافع اور سود کی شکل میں وصول کر لیتا ہے اور زمین بھی عام طور پر مالک کی ملکیت ہوتی ہے۔ اس لیے زمین کا معاوضہ ''لگان'' کی صورت میں بھی مالک کی جیب میں جاتا ہے۔ جب کہ محنت کشوں کو معمولی اُجرت لینے پر مجبور کر دیا جاتا ہے۔

2.10۔ تبادلہ دولت (Exchange of Wealth)

پیدا شدہ دولت اور تقسیم شدہ دولت کے بعد مالکان باہمی رضامندی سے اپنی ملکیتی اشیا کے درمیان بالعوض تبادلہ کرتے ہیں۔ اسے ''تبادلہ دولت'' کہا جاتا ہے۔ تجارت اور اس سے متعلقہ تمام امور اسی اصطلاح کے ذیل میں آتے ہیں۔

2.11۔ زر (Money)

تبادلہ اشیا کے عمل کو آسان بنانے کے لیے سونے چاندی کو بطورِ زر استعمال کیا جاتا ہے۔ زر کی حقیقی تعریف تو صرف یہ ہے کہ ''وہ ایک آلہ مبادلہ ہے، جو قانونی طور پر تبادلہ اشیا کے لیے استعمال میں لایا جاتا ہے۔''

www.rahimia.org

اس کی تعریف اس طرح بھی کی جاتی ہے: ''زر وہ شئے ہے، جو بہ طورِ آلۂ مبادلہ قبولیتِ عامہ کا حامل ہو اور جو ساتھ ہی پیمائش قدر اور ذخیرۂ قدر کا کام بھی سرانجام دے۔''

پھر زر کی دو قسمیں ہیں:

i۔ حقیقی زر: جو کہ سونے چاندی پر مشتمل ہے۔

ii۔ اعتباری زر: چیک وغیرہ اور کاغذی نوٹ اور بینکوں کی طلبی امانتوں (Demand Deposits) پر مشتمل ہوتا ہے۔

2.12۔ منڈی (Market)

عام طور پر منڈی سے مراد ایسی جگہ لی جاتی ہے، جہاں مختلف اشیا کی خرید و فروخت کی دوکانیں ہوتی ہیں اور خریدار وہاں جا کر اپنی ضروریات کی اشیا خریدتے ہیں، لیکن معاشیات میں یہ لفظ وسیع مفہوم میں استعمال کیا جاتا ہے۔ معاشیات میں منڈی سے مراد کوئی خاص جگہ نہیں ہوتی، بلکہ وہ تمام علاقہ ہوتا ہے، جس میں خریدار اور فروخت کار آپس میں آسانی سے مل سکیں اور اشیا کا لین دین کر سکیں۔

2.13۔ قدر (Value)

معاشیات میں ''قدر'' دو اشیا کی اُس نسبت کو کہتے ہیں، جس پر اُن کا آپس میں تبادلہ ہوسکتا ہو۔ دوسرے لفظوں میں قدر سے مراد کسی شئے کی اپنے بدلے میں دوسری اشیا حاصل کرنے کی طاقت یا قوتِ خرید (Purchasing Power) ہے۔

2.14۔ قیمت (Price)

جب کسی چیز کی قدر کو زر یا روپے پیسے کی شکل میں ظاہر کیا جائے تو وہ اس چیز کی ''قیمت'' کہلاتی ہے۔ فقہی نقطہ نظر سے بازار میں اشیا کے لیے جو زر متعین کیا جاتا ہے، اُسے ''قیمت'' کہتے ہیں اور خریدار اور فروخت کنندہ بازاری قیمت سے قطع نظر جس رقم پر سودا طے کرلیں، اُسے ''ثمن'' کہا جاتا ہے۔

2.15۔ طلب (Demand)

عام بول چال میں طلب سے مراد کسی شئے کی ضرورت یا خواہش کی جاتی ہے، لیکن معاشیات میں کوئی خواہش اس وقت تک ''طلب'' کا درجہ حاصل نہیں کرسکتی، جب تک کہ خواہش رکھنے والے شخص کے پاس اس خواہش کو پورا کرنے کے وسائل اور اُسے پورا کرنے کا ارادہ نہ ہو۔ اس لیے کہ وسائل (رقم) کے بغیر کسی شئے کو خریدنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اور ارادہ اس لیے ضروری ہے کہ اگر رقم بھی موجود ہو، لیکن اس شئے کی خریداری کا ارادہ نہ ہو تو اس صورت میں بھی خواہش پوری نہ ہوسکے گی۔

2.16۔ قانونِ طلب (Law of Demand)

جب کسی شئے کی قیمت کم ہوجاتی ہے تو اس کی طلب بڑھ جاتی ہے اور جب قیمت میں اضافہ ہوجاتا ہے تو مقدارِ طلب کم ہوجاتی ہے۔ قیمت میں تبدیلی کی وجہ سے مقدارِ طلب میں جو کمی بیشی ہوتی ہے، اسے سرمایہ دارانہ معاشیات میں ایک اصول کی

www.rahimia.org

حیثیت حاصل ہے، جسے ''قانونِ طلب'' کہا جاتا ہے اور یہ قانون یہ ہے کہ:

''باقی امور بدستور رہتے ہوئے اگر کسی شئے کی ''قیمت'' میں اضافہ ہوجائے تو اس کی ''طلب'' سکڑ جاتی ہے اور قیمت گر جائے تو طلب پھیل جاتی ہے۔''

'باقی امور بدستور' کا مطلب یہ ہے کہ مثلاً صارفین کی پسند، اُن کا ذوق اور فیشن وغیرہ تبدیل نہ ہو، نیز ان کی آمدنی میں کمی بیشی نہ ہو اور آبادی کی تعداد میں بھی کمی یا اضافہ نہ ہو۔

2.17۔ رسد (Supply)

رسد سے مراد اشیا کی وہ تعداد یا مقدار ہے، جو ایک خاص قیمت پر منڈی میں فروخت ہونے کے لیے پیش کی جاتی ہے۔ مثلاً 18 روپے فی کلوگرام کے حساب سے 500 کلو شکر فروخت کے لیے منڈی میں لائی جاتی ہے۔ ایسی صورت میں شکر کی یہ مقدار معاشی اصطلاح میں شکر کی ''رَسد'' کہلائے گی۔

2.18۔ قانونِ رسد (Law of Supply)

قانونِ رسد اصل میں قانونِ طلب کے بالکل برعکس ہوتا ہے، یعنی ''قیمت'' بڑھنے کی صورت میں ''رسد'' میں اضافہ ہوتا ہے اور قیمت کم ہونے کی صورت میں رسد میں کمی واقع ہوتی ہے۔ قانونِ رسد کو ان الفاظ میں بیان کیا جاسکتا ہے:

''باقی امور بدستور رہتے ہوئے اگر کسی شئے کی قیمت میں اضافہ ہوجائے تو اس کی رسد بڑھ جاتی ہے اور اگر قیمت میں کمی واقع ہوجائے تو رسد میں کمی آجاتی ہے۔''

2.19۔ بینک (Bank)

بینک سے مراد وہ ادارہ ہے ''جو اپنے اور دوسروں کے قرضوں کا کاروبار کرتا ہے۔ بینک کا کاروبار یہ ہے کہ وہ لوگوں سے قرض لے اور دوسرے لوگوں کو قرض دے۔ اور یوں زر کی تخلیق کرے۔''[(25)]

2.20۔ صَرفِ دولت (Consumption of Wealth)

جس طرح انسان مادہ (Matter) کو تخلیق نہیں کرسکتا، اسی طرح اُسے ضائع اور فنا بھی نہیں کرسکتا، بلکہ اُس کے استعمال سے مادہ ایک حالت سے دوسری حالت میں تبدیل ہوجاتا ہے۔ اس طرح اس کی افادیت اور صلاحیت کو استعمال میں لا کر اُس افادیت کو زائل کرسکتا ہے۔ چناں چہ دولت کے صَرف سے مراد یہ ہے کہ کسی شئے میں پیداشدہ افادہ کو زائل کرکے اپنی ذاتی یا کاروباری ضروریات کو پورا کرنا۔

پھر سرمایہ دارانہ نقطۂ نظر سے ''صَرف'' کا تعلق صِرف ذاتی استعمال کے ساتھ خاص ہے۔ اسی لیے ان کے نزدیک ''اشیائے صَرف'' میں وہ ''دولت'' داخل ہے، جسے انسان براہِ راست استعمال کرکے خرچ کرلے اور وہ اشیا جن سے مزید کمانا مقصد ہو تو انھیں سرمایہ دارانہ نقطۂ نظر سے ''اشیائے سرمایہ'' کہا جاتا ہے۔

سوشلسٹ نقطۂ نظر سے ''صَرف'' کا مفہوم ہر قسم کی دولت کے لیے عام ہے۔ خواہ وہ براہِ راست استعمال کرکے ''صَرف''

www.rahimia.org

ہو جائے یا بالواسطہ طور پر مزید پیداوار کے لیے اس کا ''صَرف'' ہو جائے۔

اسلام کے نقطہ نظر سے کسی شئے میں پیدا شدہ افادیت کا خرچ ہونا ''صَرف'' ہے۔ پھر اس کی تین صورتیں ہیں:

i۔ **اسراف و تبذیر**: ذاتی یا کاروباری ضروریات سے زائد کسی چیز کو خرچ کرنا۔

ii۔ **بخل و تقتیر**: ذاتی یا کاروباری ضروریات سے کم خرچ کرنا۔

iii۔ **اعتدال و توازن**: ذاتی و کاروباری ضروریات کے مطابق کسی شئے کی افادیت کو اعتدال و توازن سے خرچ کرنا۔

اسلام نے صَرف کے پہلے دو طریقوں کی ممانعت کی ہے اور تیسرے راستے اعتدال اور توازن کا حکم دیا ہے۔

(3) معاشیات کے بنیادی شعبے

انسانی احتیاجات کی تسکین کے لیے وسائل معیشت کے حصول کے تین بنیادی ذرائع ہیں:

1۔ زراعت (Agriculture) 2۔ صنعت (Industry) 3۔ تجارت (Trade)

3.1۔ زراعت (Agriculture)

معاشیات کا پہلا انتہائی اہم شعبہ زراعت ہے، اس میں ''زمین'' میں ''محنت'' کر کے اشیا میں ''افادیت'' پیدا کی جاتی ہے۔ یہ افادۂ تحفظ کی صورت میں ہوتا ہے۔ ایک کاشت کار فصل وغیرہ کاشت کر کے اس کی حفاظت کرتا ہے۔ اس وسائل معاش میں بڑھوتری اور نشوونما کا کردار ادا کر کے افادیت پیدا کرتا ہے۔ انسانیت کا ابتدائی دورِ زراعت ہی کی نشوونما اور ترقی کا مرہونِ منت ہے۔ یہ شعبہ اپنی اہمیت کے اعتبار سے آج بھی بنیادی ذرائع پیدائش دولت سے تعلق رکھتا ہے۔ اس شعبے کی بہت سی ذیلی شاخیں ہیں۔ زمین کی کاشت کاری سے لے کر جانوروں کی پرورش تک بہت سے شعبے ہیں۔

3.2۔ صنعت و حرفت (Industry and Handicraft)

معاشیات کا دوسرا اہم ترین شعبہ صنعت و حرفت ہے۔ اس شعبے میں پیدا شدہ وسائل یا قدرتی مادے میں ''افادۂ شکل'' (Utility of Form) کے ذریعے سے افادیت پیدا کی جاتی ہے۔ ابتدائی زمانے میں یہ دست کاری اور حرفت کی شکل میں تھی۔ صنعتی دور کے آنے کے بعد بطور انڈسٹری کے اس کا رواج ہوا۔

جدید دور میں ''صنعت'' کسی بھی معاشی شعبے میں پیداواریت کی موجود جملہ تنظیمی اکائیوں کے مجموعے کا نام ہے اور ''صنعتی فرم'' ایک تنظیمی اکائی کے لیے بولا جاتا ہے۔ گویا ''صنعتی فرم'' کی حیثیت جز کی ہے اور اس شعبے کی ''صنعت'' کی حیثیت کل کی ہے۔ مثلاً ایئرکنڈیشن کے شعبے کی صنعت میں اے سی بنانے والی ایک فیکٹری مثلاً ''ہائیر فرم'' کہلائے گی، جب کہ اے سی بنانے والی تمام فیکٹریاں مثلاً جنرل، مٹسوبشی، گری اور ایل جی وغیرہ کا مجموعہ اس شعبے کی ''صنعت'' شمار ہوگا۔

3.3۔ تجارت (Trade)

معاشیات کا تیسرا اہم ترین شعبہ تجارت ہے۔ جس کا مطلب ''افادۂ مقام'' (Utility of Place) کے ذریعے سے وسائل معاش میں افادیت پیدا کرنا ہے۔ اس طرح تجارت میں ''تبادلہ اشیا'' کے ذریعے خریدار اور فروخت کنندہ اپنی اپنی انسانی

www.rahimia.org

ضروریات کی تسکین کرتے ہیں۔ چناں چہ جب بھی کسی معاشرے میں دو یا زیادہ افراد آپس میں اشیا و خدمات کا لین دین کرتے ہیں تو معاشیات میں اس خرید وفروخت کو تجارت کہا جاتا ہے۔ اشیا و خدمات کی یہ خرید وفروخت جس مقام پر ہوتی ہے، اُسے ''منڈی'' کہا جاتا ہے۔

جب تجارت ملک کے مختلف حصوں یا علاقوں کے درمیان کی جائے تو اسے اندرونی یا داخلی تجارت (Domestic Trade) کہتے ہیں۔ جب کہ دو یا دو سے زیادہ ملکوں کے درمیان تجارت کو بیرونی یا غیرملکی تجارت (Foreign Trade) کہا جاتا ہے۔

(4) معاشیات کے اہم ادوار

4.1۔قدرتی وسائل کے استعمال کا دور

انسان کے ابتدائی ادوار میں انسانی احتیاجات کی تسکین؛ قدرت کے پیدا کردہ وسائل سے ہی کی جاتی تھی۔ یعنی اشیا کی ''قدرتی افادیت'' ہی انسانی احتیاجات کی تسکین کا باعث بنتی تھی۔ بعد کے زمانے میں انسان میں زراعت، صنعت، تجارت وغیرہ کے ذریعے سے ''تخلیقی افادیت'' پیدا کر کے اپنی احتیاجات کی تسکین کا نظام قائم ہوا۔

4.2۔ زرعی دور

انسانی زندگی کے اگلے ارتقائی مرحلے میں ''تخلیقی افادیت'' کا پہلا مرحلہ ''زراعت'' کی صورت میں شروع ہوا۔ یعنی اس نے زمین پر موجود قدرتی نباتات کے تحفظ، پرورش اور نشوونما کے ذریعے سے زرعی حوالے سے اشیا میں ''افادیت'' پیدا کرنا شروع کی۔ اور پھر آگے چل کر ''مصنوعی کاشت'' کا طریقہ دریافت کیا۔ جس سے ''افادۂ تحفظ'' میں وسعت پیدا ہوئی۔ قدیم مفکرین کے ہاں زراعت کے لیے ''فلاحت'' کا لفظ غالبًا اسی لیے استعمال ہوتا رہا ہے کہ اس دور میں نباتات کی بقا اور تحفظ کے لیے کی جانے والی محنت اور کوششوں کو ''فلاحت'' (بقا و پرورش) کے معنی میں استعمال کیا گیا ہے۔

اس دور میں انسانی احتیاجات کی تسکین کے لیے ''تخلیقی افادیت'' سے پیدا ہونے والی اشیا کو بالادستی حاصل ہوئی اور قدرتی اشیا کے استعمال کی حیثیت ثانوی ہوتی چلی گئی۔ اس دور میں پیدائش دولت کا اہم ترین ذریعہ ''زمین'' قرار پائی۔ ابتدائی زرعی دور میں زمین کے وسائل سے اجتماعی طور پر استفادہ کرنے کا سماجی نظام قائم ہوا، لیکن جیسے جیسے وقت گزرتا گیا، زمین پر قابض طبقات نے اس دور کے ذریعۂ پیدائش دولت (یعنی زمین) پر اجارہ داری قائم کر کے ''فیوڈلزم'' کی بنیاد رکھی۔ اس طرح زمین پر قبضے کی اساس پر زرعی دور میں جاگیردارانہ سوچ نے تمام سماجی، معاشی اور سیاسی رشتوں کی نوعیت اجتماعیت کی بجائے انفرادیت اور طبقاتیت کی صورت میں قائم کر دی۔

دنیا کے مختلف خطوں میں زرعی دور کے ارتقا کے مراحل یکساں نہیں رہے۔ کسی خطے میں زراعت کی ترقی کا دور بہت پہلے شروع ہوا اور کسی دوسرے براعظم میں زرعی ترقیات کا دور بعد میں ظہور پذیر ہوا۔ یورپین معاشرے میں زرعی دور کے اجارہ داری طریقے کو ''فیوڈلزم'' کا نام دیا گیا ہے۔

www.rahimia.org

4.3۔ تجارتی دور

زرعی ترقیات کے بعد اگلا دور زرعی اشیا یا حرفتی مصنوعات کے باہمی تبادلے کی بنیاد پر تجارت کی صورت میں ظاہر ہوا۔ ابتدائی زمانے کی تجارت بارٹر سسٹم (شئے کے بدلے شئے) کے تحت جاری رہی، لیکن اس سے تبادلہ اشیا کے عمل میں مشکلات پیدا ہوئیں تو تبادلے میں سہولت پیدا کرنے کے لیے سونا اور چاندی کی صورت میں ''زر'' کی تخلیق ہوئی اور اس کے نتیجے میں تجارتی عمل تیز رفتاری کے ساتھ انسانی معاشروں میں فروغ پذیر ہوا۔ اس طرح انسانی معاشرے میں زراعت کے مقابلے پر تجارت کو بالادستی حاصل ہوگئی۔

تجارتی دور میں انسانی سماج کے تمام سیاسی، سماجی اور معاشی روابط و تعلقات پر اشیائے تجارت اور قدرِ تبادلہ یعنی زر کو بالادستی حاصل ہوتی چلی گئی۔ زر پر کنٹرول رکھنے والے طبقات نے بتدریج تعاونِ باہمی کے اس تجارتی عمل کو ''مرکنٹائلزم'' کی صورت دے دی۔ اس طرح ''تجارتی نظریۂ زر'' نے بالادستی حاصل کر کے استحصال کے نئے راستے کھولے۔ یہ تجارتی دور بھی مختلف براعظموں میں یکساں طور پر نہیں آیا، بلکہ صدیوں کے فاصلوں کے ساتھ مختلف براعظموں میں اس کے ارتقائی مراحل مختلف صورتوں میں ظاہر ہوئے۔

4.4۔ صنعتی دور

تجارتی دور کے بعد مشین کی ایجاد سے صنعتی دور کا آغاز ہوا۔ اگرچہ ابتدائی صنعت و حرفت جو ہنرمندوں کی دست کاری کی صورت میں وجود میں آئی تھی، ابتدائی دور میں بھی رہی ہے۔ زرعی اور تجارتی ادوار میں ہاتھ سے بنی ہوئی مصنوعات کی صورت میں اشیا میں افادیت پیدا کی جاتی رہی۔ لیکن تقریباً دوسو سال قبل مشین کی ایجاد نے صنعت کو ایک نیا رُخ دیا اور اشیا کی پیدائش کے عمل کو تیز تر کر کے صنعت کو زراعت اور تجارت پر بالادستی دے دی۔

صنعتی دور کے آغاز سے ہی ''تجارتی نظریۂ زر'' آگے بڑھ کر ''سرمایہ'' کی صورت میں نمودار ہوا۔ اس طرح سرمائے کی طاقت نے صنعت کے پیداواری عمل کو تیز تر کر دیا۔ اور یوں سرمائے کے انفرادی اور طبقاتی استعمال نے انسانی معاشرے میں کیپٹل اِزم کو وجود بخشا۔ تمام تر سیاسی، سماجی اور معاشی تعلقات بہ شمول زراعت اور تجارت' سرمائے کی بالادستی کے تابع ہو کر رہ گئے۔ حال آں کہ صنعت کی اس ایجاد نے اس بات کو یقینی بنایا تھا کہ ایک مشین پر جب تک مزدوروں کی ایک جماعت مل کر اشیا کی پیدائش کا عمل نہیں کرتی، اس وقت تک کسی بھی فیکٹری سے بھرپور نتائج حاصل نہیں کیے جاسکتے۔ افراد کی اجتماعی طاقت سے پیدا ہونے والی مصنوعات کی پیدائش کے نتیجے میں صنعت کے اجتماعی پہلو کو تعاونِ باہمی کی اساس پر زیادہ واضح طور پر اُبھر کر سامنے آنا چاہیے تھا، لیکن سرمایہ داروں کے استحصالی طبقات نے صنعت کے اجتماعی عمل کو مخصوص افراد کے مفادات کا ذریعہ بنا کر رکھ دیا۔

(5) نظام ہائے معیشت

جب کسی بھی مدرسۂ فکر (School of Thought) کی روشنی میں ایسا ادارتی سلسلہ قائم کیا جائے، جس میں انسانی احتیاجات کی تسکین کے لیے وسائل معاش کی پیدائش، تقسیم، تبادلہ اور صَرف کے بنیادی تصورات، اصول اور ضابطے، حکمتِ عملی

www.rahimia.org

اور طریقۂ کار وضع کیا گیا ہو۔ اور ان پر عمل درآمد کے ذمہ دار افراد کے فرائض اور ذمہ داریوں کا ایک باقاعدہ اور مربوط نظام قائم کیا جائے تو اُسے اُس مدرسۂ فکر کا ''نظامِ معیشت'' کہا جاتا ہے۔ انسانی تاریخ کے اہم معاشی ادوار (زرعی دور، تجارتی دور اور صنعتی دور) کا تجزیہ کرنے والے مفکرین اور ماہرین نے ان ادوار میں درجِ ذیل نظام ہائے معیشت کا تعین کیا ہے۔

5.1۔ فیوڈلزم

زرعی دور میں پیدائش دولت کا مرکز و محور ''زمین'' رہی ہے۔ جب تک زرعی معیشت' اجتماعیتِ انسانی کی بنیاد پر کام کرتی رہی تو انسانیت کے لیے کوئی مشکلات پیدا نہیں ہوئیں۔ لیکن جب زرعی دور میں ''زمین'' پر آمریت پسند لوگوں نے نسلی یا طبقاتی بنیادوں پر ادارتی تسلط حاصل کیا تو فیوڈل تصورات اور اصول و ضابطے سامنے آئے۔ فیوڈل لارڈز نے زمین پر مبنی زرعی معیشت کے وسائل پر قبضہ کیا۔ اسے اجتماعیت کے دائرے سے نکال کر انفرادی مفادات کے طور پر بروئے عمل لائے۔ استحصال کرنے والے اشخاص اور ان کی ذمہ داریوں کا ادارتی سلسلہ اور نظام قائم ہوا۔ اس طرح زمین کو شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی اصطلاحات کے تناظر میں ''رأیِ کُلّی'' یعنی اجتماعی مفادِ عامہ کے بجائے ''رأیِ جُزئی'' یعنی انفرادی یا گروہی مفاد کے لیے استعمال کرنے کا سلسلہ شروع کیا۔ یورپ کی معاشی تاریخ میں وسائل معاش پر اس طرح کے انفرادی تسلط نے سیاسی، سماجی اور معاشی حوالے سے جو نظام تشکیل دیا، اُسے فیوڈلزم کہا جاتا ہے۔

دنیا کے مختلف براعظموں پر ''زمین'' کی بنیاد پر انسانیت کے استحصال کی مختلف شکلیں زرعی ادوار میں قائم رہی ہیں۔ یورپین سماج میں گیارہویں صدی عیسوی سے لے کر سولہویں صدی عیسوی تک کا دور' فیوڈلزم کا دور کہلاتا ہے۔

5.2۔ مرکنٹائل اِزم

تجارت کی بنیاد پر وسائل معاش کی ترقیات کا زمانہ' تجارتی دور کہلاتا ہے۔ تبادلہ اشیا کا اصل تصور تعاونِ باہمی کی اساس پر اجتماعی مفادِ عامہ کے لیے اشیا کی افادیت کے تبادلاتی عمل کو فروغ دینا تھا۔ تجارتی دور میں زر کی تخلیق کا عمل بھی تعاونِ باہمی کے تقاضوں کے تحت وجود میں آیا۔ چناں چہ ایک زمانے تک اجتماعی مفاد کے مطابق تبادلہ اشیا کا عمل براہِ راست یا زر کے واسطے سے جاری رہا۔ لیکن جب انفرادی مفادات کے حامل افراد نے تجارتی اشیا اور زر پر قبضہ کیا اور سوسائٹی کے اجتماعی مفادات کو پس پشت ڈال دیا تو ''تجارتی نظریۂ زر'' وجود میں آیا۔ اس کے نتیجے میں ایسا ادارتی سلسلہ قائم ہوا، جس میں تجارتی عمل کے انفرادی تصورات، اصول وضوابط پر مبنی نظامِ معیشت کی صورت گری ہوئی۔ یورپ کی معاشی تاریخ میں اس کو مرکنٹائل اِزم کہا جاتا ہے۔

یہ نظام بھی دنیا کی مختلف اقوام میں مختلف شکلوں میں رائج رہا ہے۔ یورپین سماج میں مرکنٹائل اِزم کا دور سولہویں صدی سے اٹھارویں صدی تک کا زمانہ رہا ہے۔

5.3۔ کیپٹل اِزم

صنعت وحرفت کی اساس پر وسائل معاش کی پیدائش کا عمل انسانیت کے ابتدائی دور سے ہی جاری رہا ہے۔ اس کی اساس قدرتی اشیا میں انسانی محنت کے ذریعے سے پیدا ہونے والی افادیت کے اجتماعی عمل پر تھی۔ افراد بھی اجتماعی مفاد کے لیے اشیا کی

www.rahimia.org

مصنوعات تیار کرتے تھے اور وہ ایک اجتماعی عمل کے ذریعے انسانیت میں تعاونِ باہمی کو فروغ دینے کا باعث ہوتا تھا۔ لیکن مشین کی ایجاد کے بعد اس اجتماعی عمل کی تنظیم نو ہوئی اور ایک مشین پر مزدوروں کی اجتماعی محنت نے پیداوار کے عمل کو تیز تر کر دیا۔ اس ایجاد سے حقیقت میں انسانی مفاد کے حوالے سے بڑی سہولت پیدا ہوئی۔

اس ایجاد کا تعاونِ باہمی کے اصول پر استعمال یقیناً انسانیت کے لیے ترقی کا باعث ہوتا، لیکن یہاں بھی انفرادی اور طبقاتی مفادات کے حامل گروہوں نے مشین پر قبضہ کر کے صنعتی پیداواری عمل کو مخصوص طبقات کے مفادات کے لیے استعمال کیا۔ اس طرح پیدا شدہ وسائل معاش کو مزید پیدائش دولت کے لیے استعمال کرنے کے نتیجے میں ''کیپٹل'' وجود میں آیا۔ یوں صنعتی دور میں کیپٹل ایک اقتصادی طاقت کے طور پر سامنے آیا اور کیپٹل پر قابض طبقات نے اس کی اساس پر معاشی تصورات، اصول، ضابطے اور طریقہ ہائے کار متعین کیے اور ایک باقاعدہ ادارتی سلسلے کو منظّم کیا۔ اس طرح سے صنعتی دور میں ''کیپٹل اِزم'' وجود میں آیا۔

کیپٹل اِزم کا ظہور سب سے پہلے یورپین سماج میں صنعتی دور میں ہوا۔ اٹھارہویں صدی سے لے کر اب تک دنیا کے بہت سے ممالک میں کیپٹل اِزم کا تسلط ہے۔

5.4۔ سوشلزم/کمیونزم

صنعتی دور میں مشین کی ایجاد کے بعد کیپٹل اِزم کے پیدا شدہ مسائل کو حل کرنے کے لیے سوشلزم وجود میں آیا۔ اس نظام میں ہی ریاست کے ادارتی سلسلے کے تحت صنعتوں کے استعمال کے اشتراکی تصورات کو سامنے رکھتے ہوئے دولت کی پیدائش، تقسیم، تبادلہ اور صَرف کے نظریات و افکار، اصول اور ضابطے، طریقۂ کار اور حکمتِ عملی پر مبنی جو نظام وجود میں آیا، اُسے سوشلزم کہا جاتا ہے۔ ریاستی طاقت کے بغیر افراد کے اجتماعی کمیونزم پر مبنی ادارتی سلسلے پر مبنی اجتماعی معاشی نظام کو ''کمیونزم'' کہا جاتا ہے۔

5.5۔ اسلام کا اقتصادی نظام

دینِ اسلام کی اقتصادی تعلیمات کی روشنی میں تمام زرعی، تجارتی اور صنعتی ادوار میں اجتماعی ادارتی نظام قائم رہے ہیں۔ دینِ اسلام کی معاشی تعلیمات انسانی احتیاجات کا تعین اور وسائل معاش کی پیدائش، تقسیم، تبادلہ اور صَرف کے اساسی نظریات، اصول اور ضابطے، حکمتِ عملی اور طریقۂ کار کی نشان دہی کرتی ہیں۔ اور ان تعلیمات کے مجموعی اور مربوط نظام کو اسلام کا اقتصادی نظام کہا جاتا ہے۔ چوں کہ دینِ اسلام ان تمام پہلوؤں کے حوالے سے بنیادی رہنمائی اور قوانین وضوابط، عملی سیرت و کردار پیش کرتا ہے، اس لیے اسلام کی اقتصادی تعلیمات ایک مکمل نظامِ فکر و عمل کی حیثیت رکھتی ہیں۔

بعض حضرات کا یہ تصور کہ ''اسلام کوئی معاشی نظام نہیں ہے۔ ...اسلام صرف چند بنیادی اقتصادی اقدار کی نشان دہی کرتا ہے اور کوئی نظام نہیں رکھتا'' [26] قطعی طور پر غلط ہے۔ اس لیے کہ ساتویں صدی عیسوی سے لے کر اٹھارہویں صدی عیسوی تک تقریباً ایک ہزار سال کے عرصے میں اسلامی حکومتوں کے دور میں اسلام کا اقتصادی نظام دنیائے انسانیت پر نافذ العمل رہا ہے۔ اس جدید صنعتی دور میں بھی یہ نظام قائم کیا جا سکتا ہے۔

www.rahimia.org

یورپین معاشروں کے معاشی افکار و نظریات کا ارتقا

یورپین سماج میں معاشی ارتقا کے مختلف مراحل رہے ہیں۔ چناں چہ زرعی دور میں فیوڈل اِزم، تجارتی دور میں مرکنٹائل اِزم اور صنعتی دور میں کیپٹل اِزم بالترتیب وجود میں آئے۔ یورپ کے معاشی ارتقا کا اب تک دریافت شدہ اجتماعی عملی مرحلہ سوشلزم اور تصوراتی طور پر اجتماعی نظریۂ کمیونزم ہے۔ مولانا عبیداللہ سندھیؒ نے کہا ہے کہ: ''یورپ نے جو تحریکات متعارف کرائی ہیں، ان کا آخری مرحلہ سوشلزم ہے۔''(27)

چناں چہ یورپین سماج کے ارتقا کے حوالے سے:

☆ فیوڈلزم کا دور (بارہویں صدی عیسوی سے سولہویں صدی تک)

☆ مرکنٹائل اِزم کا دور (سولہویں صدی سے اٹھارہویں صدی تک)

☆ کیپٹل اِزم کا دور (اٹھارہویں صدی سے بیسویں صدی تک)

☆ سوشلزم کا دور (بیسویں صدی میں مشرقی یورپ اور ایشیا کے کچھ علاقے پر قائم ہوا۔)

جہاں تک ایشیا، افریقا اور اندلس وغیرہ میں معاشی حوالے سے ارتقا کے مراحل ہیں۔ تو ان خطوں میں زرعی اور تجارتی ترقی کا دور اسلام کی تعلیمات کے سبب بہت پہلے اصلاح و ترقی کے مراحل سے گزر چکا ہے۔ چوں کہ صنعتی دور کا آغاز یورپ سے ہوا اور اس دور کے آغاز سے ہی سرمایہ دارانہ نظام بھی یورپ میں آیا، جس میں صنعتی حوالے سے ہونے والی ترقی کو شروع سے ہی کیپٹل اِزم کا رُخ دے دیا۔ چناں چہ انفرادیت کے نقطہ نظر سے صنعتی دور کے پیداواری رشتوں کی ترتیب سرمایہ دارانہ تصورات کے تحت قائم کی گئی۔ اس طرح عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ صنعتی دور اور سرمایہ دارانہ افکار و نظریات دونوں ایک دوسرے کے ساتھ لازم ملزوم ہیں، حال آں کہ حقیقتاً ایسا نہیں ہے۔

سرمایہ دارانہ طرزِ فکر و عمل کے اس ظلم نے عام انسانیت کے لیے مصائب کے پہاڑ توڑے تو خود یورپ میں ہی اس کے خلاف ایک واضح ردِعمل سامنے آیا۔ چناں چہ یورپین معاشرے میں ہی ایسے افکار و خیالات اور معاشی نظریات سامنے آئے، جنھوں نے سرمایہ دارانہ نظام کی خرابیوں کو دور کرنے کی کوشش کی۔ اور صنعتی دور میں کسی حد تک انسانیت کے مفادات کو اجتماعی رُخ دینے کے لیے سوشلزم اور کمیونزم کے افکار و نظریات وجود میں آئے۔

اس تناظر میں اس چیز کی اہمیت بہت بڑھ جاتی ہے کہ جس طرح اسلام نے ایشیا، افریقا اور اُندلس وغیرہ میں زرعی دور اور تجارتی دور کے حوالے سے انقلابی معاشی تعلیمات کے ذریعے معاشی نظام میں تبدیلیاں پیدا کیں اور انھیں انسان دوست بنانے میں کردار ادا کیا۔ اسی طرح صنعتی دور کے پیداواری رشتوں کو اسلام کی انسانیت نواز تعلیمات کی روشنی میں درست کرنے کا لائحۂ عمل پیشِ نظر رکھا جائے اور ہدف یہ ہو کہ جدید صنعتی دور میں معاشیات کے حوالے سے اسلام کی تعلیمات ہماری کیا رہنمائی کرتی ہیں۔

اس سلسلے میں اسلام کی معاشی تعلیمات پر گفتگو کرنے سے پہلے ضروری ہے کہ یورپین سماج میں معاشی حوالے سے ارتقا کے جو مختلف مراحل سامنے آئے ہیں، ان کے بنیادی تصورات، افکار و نظریات کا مطالعہ کیا جائے۔ ذیل میں یورپین سماج کے معاشی ارتقا کے ان مختلف مراحل اور نظاموں کا ایک جائزہ پیش کیا جاتا ہے۔

www.rahimia.org

(1) فیوڈل اِزم (Feudalism)

فیوڈل اِزم کی اصطلاح یورپین سماج میں گیارہویں صدی عیسوی سے لے کر سولہویں صدی تک کے دور کے بارے میں استعمال کی جاتی ہے۔ اگرچہ اس کا آغاز آٹھویں صدی سے ہوجاتا ہے۔ اس دور کا تعلق یورپ میں ہونے والی زرعی ترقیات سے ہے۔ اس سے پہلے کا یورپ زرعی حوالے سے ترقی یافتہ نہ تھا۔ فیوڈل اِزم کے بنیادی تصورات زرعی پیداواری رشتوں کے ساتھ جڑے ہوئے ہیں۔ یہ تصورات زرعی پیداواری رشتوں کی ایسی ترتیب پر قائم ہیں، جہاں ایک طبقہ' نسلی طبقاتی امتیاز کی وجہ سے ''زمین'' پر قابض ہوجاتا ہے۔ یہ طبقہ زمین سے متعلق تمام پیداواری رشتوں کو انسانیت دوستی کی بنیاد پر استعمال کرنے کے بجائے گروہی اور طبقاتی مفاد کے لیے استعمال کرتا ہے۔ گویا فیوڈل لارڈز کے زمین کے وسائل پر قبضے سے ایسا سیاسی اور معاشی نظام قائم ہوا کہ زمین پر کام کرنے والے عام انسانوں کو عملاً حیوان بنا کر رکھ دیا گیا۔ انسانوں کی آزادی و حریت سلب ہوکر رہ گئی اور ان کی محنت کا استحصال کرکے ''دولت'' میں اضافہ کیا جاتا رہا۔

فیوڈل اِزم کا تاریخی پس منظر

ابتدائی زمانے میں ''زمین'' تمام انسانوں کی ملکیت سمجھی جاتی تھی اور انتفاع کے لحاظ سے سب میں مشترک تھی۔ جو شخص پہلی مرتبہ کسی زمین کو استعمال کرنا شروع کردیتا، اُس پر اُس کی عارضی ملکیت قائم ہوجاتی اور یہ ملکیت اس وقت تک قائم رہتی، جب تک اس پر اس کا قبضہ رہتا تھا۔ قبضے کے ہوتے ہوئے اس کو بے دخل کرکے کسی دوسرے شخص کا قابض ہوجانا' انصاف اور قانونِ فطرت کے خلاف سمجھا جاتا تھا۔ البتہ قبضہ باقی نہ رہنے کی صورت میں دوسرے شخص کو اس زمین کے استعمال کرنے کا حق حاصل تھا۔ چوں کہ ایسے قبضے کے ہونے کی صورت میں طاقت کا ہونا ضروری تھا اور اس بات کا قوی امکان رہتا تھا کہ اس سے زیادہ طاقت ور شخص کو یہ مقام پسند آ گیا تو وہ اس کو بے دخل کرکے خود اس پر قبضہ کرلے گا۔ اس لیے اس عارضی ملکیت پر انسان زیادہ دنوں قناعت نہ کرسکا، بلکہ اس حقیقت کے واضح ہونے کے بعد ہی مستقل ملکیت کا تصور قائم ہوا۔ پہلے تو صرف زمین استعمال کرنے کا حق تھا، لیکن مستقل ملکیت کا تصور قائم ہونے کے بعد زمین دار کی ذاتی حیثیت کی بنیاد پڑ گئی۔ ابتداءً قبضے نے بلا شرکت ِغیرے نفع اٹھانے کا حق پیدا کیا۔ اگرچہ وہ عارضی تھا، لیکن یہی بعد میں رفتہ رفتہ مستقل ملکیت کا سبب بن گیا۔ اہل روما میں جائیداد کا ابتدائی تصور یہیں سے پایا جاتا ہے۔

مستقل ملکیت کا تصور قائم ہونے کے بعد زمین اور جائیداد کا مالک ایک شخص یا خاندان نہ ہوتا تھا، بلکہ اس زمانے میں پدر سری خاندان کے نمونے پر جو اجتماعیتیں قائم تھیں، وہی اس کی مالک ہوتی تھیں اور انھیں کے ذمے اس کا پورا انتظام ہوتا تھا۔ اس کے بعد ان جماعتوں کے مشترکہ حقوق سے رفتہ رفتہ لوگوں کے شخصی حقوق علاحدہ ہوتے گئے اور بلاآخر یہاں تک نوبت پہنچی کہ شخص واحد اس کا مالک سمجھا جانے لگا۔ ابتدائی زمانے کے مالکانِ زمین آزاد آسامیوں کے ذریعے کام کرانے سے ناواقف تھے۔ اس زمانے میں بالعموم غلاموں کی جماعتیں کاشت کیا کرتی تھیں اور اس کی شکل یہ تھی کہ ادنیٰ درجے کے غلام چھوٹی چھوٹی جماعتوں میں تقسیم کردیے جاتے اور انھیں اعلیٰ اور معتبر قسم کے غلاموں کی ماتحتی میں دے کر ان کی نگرانی میں کاشت کاری کا کام انجام دیا جاتا۔

www.rahimia.org

اس کے بعد مالکوں نے آزاد آسامیوں کو زمین مستقل پٹہ پر دے کر مقررہ ''لگان'' لینے کا طریقہ رائج کیا۔ چناں چہ اس زمانے میں پہلی مرتبہ روم میں تنہا ایک فرد کے پاس بہت بڑی جائیدادوں کا ذکر ملتا ہے کہ جنھیں وہ آزاد آسامیوں کے ذریعے کاشت کراتے تھے۔ اس طریقے کے رائج ہونے کے بعد کاشت کاروں کی دو قسمیں ہوگئیں: 1۔ غلام کاشت کار 2۔ آزاد آسامی کاشت کار۔ ان نئے کاشت کاروں کے ساتھ زمین دینے کا یہ معاملہ پہلے تو معاہدے کے ذریعے طے ہوتا تھا، لیکن جب بعد میں اس شکل کو زیادہ ترقی ہوئی تو اس کے لیے ایک خاص اصطلاحی نام ''محدود ملکیت'' مقرر کردیا گیا۔ اس محدود ملکیت کو روم میں اتنی زیادہ مقبولیت حاصل ہوگئی تھی کہ کاشت کاروں کو زمین کے ساتھ دل چسپی پیدا کرانے کا یہی واحد ذریعہ سمجھا جانے گا۔ اور اس میں کاشت کاروں کو اتنے وسیع اختیارات ملنے لگے تھے کہ روم کے حکمران کاشت کار ہی کو مالک سمجھتے تھے۔ جب تک وہ وقت پر محصول ادا کرتے رہتے، زمین کے مالک کو بھی کسی قسم کی مداخلت کا اختیار نہ ہوتا تھا۔ البتہ محصول ادا نہ کرنے کی صورت میں مالک کو بے دخل کردینے کا اختیار حاصل تھا۔ روم میں یہی دوہری ملکیت کا اصول ان زمینوں میں بھی پایا جاتا تھا، جو سرحد کے فوجیوں کے پاس تھی۔ یہ سرحدی لوگ زمینوں پر بظاہر مالکانہ حیثیت سے قابض ہوتے تھے، لیکن زمین حقیقتاً حکومت ہی کی رہتی تھی۔ البتہ جب تک یہ فوجی خدمت انجام دیتے رہتے، ان لوگوں کو اس زمین پر کاشت کرنے کی پوری اجازت ہوتی تھی۔ اس صورت میں ان کی فوجی خدمتیں معمولی درجے کے محدود حقوق والے کاشت کاروں کے برابر سمجھی جاتی تھیں۔

محققین مؤرخین کی نظر میں یہی محدود ملکیت کی شکل فیوڈل اِزم کی بنیاد قرار پائی اور اس کی تمام اچھی اور بُری درجِ ذیل شکلیں اسی سے پیدا ہوئیں:

1۔ حقوقِ استفادہ نے اسی محدود ملکیت سے موروثی شکل اختیار کی۔ کیوں کہ اس طرح کی دی ہوئی تمام زمینیں عام طور پر آزاد آسامیوں کے ورثا کی طرف منتقل ہوجایا کرتی تھیں۔

2۔ انھی آزاد آسامیوں سے کھیت کو بٹائی پر دینے کا طریقہ رائج ہوا۔ کیوں کہ یہ لوگ اپنی سالانہ پیداوار کا ایک حصہ زمین کے مالکوں کو نذر کیا کرتے تھے۔

3۔ غالبًا کچھ غلاموں کی حیثیت میں ترقی اور کچھ آزاد آسامیوں کی حالت میں تنزلی سے رعایا کا درمیانی طبقہ پیدا ہوا، جو نہ تو غلام کاشت کار کی طرح مجبورِ محض اور بے بس ہوتا تھا اور نہ آزاد آسامیوں کی طرح اس کو پورے اختیارات حاصل تھے۔ یہ درمیانی طبقہ اس وقت پیدا ہوا جب آزاد آسامیوں کو پہلے جیسے حقوق و مراعات حاصل نہ ہوتے تھے اور رفتہ رفتہ زمین داروں کی گرفت سخت سے سخت ہوتی گئی تھی۔

4۔ اسی محدود ملکیت کے نظام کو دیکھ کر فیوڈل اِزم قائم کیا گیا، جس کی صورت یہ ہوئی کہ غیر مہذب قوموں کے بادشاہ تقریباً سو سال تک اس بگڑی ہوئی شکل کا بغور مطالعہ کرتے رہے اور ان کو اس کے اندر کچھ ایسے جراثیم نظر آئے کہ وہ اس پر ایک نئے نظام کی داغ بیل ڈالنے میں کامیاب ہوگئے۔

5۔ ابتدا میں تو یہ جاگیر صرف بادشاہ کے مصاحبوں کو درباداری کے صلے میں ملا کرتی تھی اور یہ لوگ اپنی ذاتی آزادی (جو خاندانی جائیداد کے مالکوں کا معزز ترین حق تھا) اس کے صلے میں قربان کردیا کرتے تھے۔ لیکن بعد میں اس کا رواج عام ہوگیا۔ یہاں تک کہ اس نظام میں کاشت کار کی حیثیت زرعی غلام کی ہوگئی تھی اور ابتدائی زمانے کے غلام کاشت کار اور ان

www.rahimia.org

نام نہاد آزاد کاشت کاروں میں کوئی زیادہ فرق باقی نہ رہا۔
الغرض! اس طرح فیوڈل اِزم کی بنیاد پڑی اور یہ سسٹم تمام رومی اور یونانی دنیا میں رائج رہا۔

فیوڈل اِزم کی تباہ کاریاں

فیوڈل اِزم نے یہاں تک تسلط حاصل کیا کہ اللہ کی زمین جو سب میں مشترک تھی اور جس کے مساویانہ حیثیت سے سب انسان حق دار تھے، زمین داروں اور جاگیرداروں کے ایک محدود طبقے میں سمٹ کر رہ گئی اور کاشت کاروں کا طبقہ جبر و تحکم کے شکنجے میں جکڑا ہوا ہر قسم کے وحشیانہ مظالم برداشت کرنے پر مجبور ہوگیا۔ اس کے نہ آزاد کاشت کار جیسے حقوق باقی رہے اور نہ رعایا کے ابتدائی حقوق، بلکہ وہ اپنی فطری صلاحیتوں اور طبعی استعدادوں کو چھوڑ کر زرعی غلام میں تبدیل ہوگیا۔ ان دونوں طبقوں میں فیوڈل لارڈز کو ہر طرح سے آزادی حاصل تھی اور دوسرا کاشت کار طبقہ ہر حیثیت سے غلام اور بے بس تھا۔ اسے زمین کو چھوڑ کر نہ کوئی دوسرا پیشہ اختیار کرنے کی اجازت تھی اور نہ اپنی محنت سے نفع اٹھانے کی سکت تھی اور نہ ہی آقاؤں کی تبدیلی کا اختیار تھا اور نہ اپنے آقاؤں سے سرخ روئی کی کوئی امید تھی۔ جیسا کہ حضرت الامام شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے قبل از اسلام کے فیوڈل دور کا تجزیہ کیا ہے۔ چناں چہ آپ رومیوں اور عجمیوں کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''طبقہ امرا کے لیے عیش و عشرت کے ساتھ زندگی گزارنے کی بس یہ شکل باقی رہ گئی تھی کہ کاشت کاروں، تاجروں اور دیگر کارپردازوں سے بھاری بھاری لگان اور کثیر مقدار کا ٹیکس وصول کیا جاتا تھا۔ جس کی وجہ سے اُن کی زندگیاں تنگ ہوگئی تھیں۔ اگر یہ لوگ اس سے انکار کرتے تو انھیں سخت سے سخت سزائیں دی جاتیں اور اگر اطاعت کرتے تو اتنی زیادہ محنت و مشقت برداشت کرنی پڑتی کہ ان کی زندگیاں گدھوں اور بیلوں کی طرح ہو جاتیں۔ یہ بے چارے ہر وقت محنت و مشقت اور خدمت گزاری میں لگے رہتے تھے۔ انھیں اتنا وقت بھی نہ ملتا تھا کہ وہ اپنی دنیاوی ذاتی مفاد کے متعلق کچھ سوچ سکیں اور اُخروی سعادت کی طرف نظر اٹھانے کی تو ان میں بالکل ہمت ہی نہیں رہی تھی۔ بسا اوقات پورے ملک میں ایک شخص بھی نہ ہوتا کہ جس کو دین کی کچھ فکر ہو۔''(28)

اس طرح یورپین معاشرہ طبقاتی کشمکش میں مبتلا تھا۔ جس کی وجہ سے فیوڈل لارڈز کی عام زندگی میں عیش پرستی آ گئی تھی اور سیاسی اقتدار شخصی آرزوؤں کو پورا کرنے کا وسیلہ بن گیا تھا۔ انفرادیت کا بھوت سب کے سر پر سوار تھا اور ریاست کی بنیاد مخصوص طبقے کی اغراض پر رکھی جاتی تھی، جس کی بنا پر اُمرا اور عوام کے درمیان زبردست خانہ جنگیاں ہوا کرتی تھیں۔ مظلوم عوام کی شورشوں کو ظالمانہ طور پر دبا دیا جاتا تھا۔ ایسی صورت میں ان کے گھروں کو جلانا، کھیتوں کو تباہ کرنا، قتل کرنا، غلام بنانا، غرض ہر قسم کا وحشیانہ سلوک عوام اور کاشت کاروں کے ساتھ جائز سمجھا جاتا تھا۔(29)

بنیادی تصورات

فیوڈل اِزم میں ''لارڈ'' زمین کا ''دہ خدا'' بن کر مذہب، سیاست، معیشت اور ثقافت کو یرغمال بنا لیتا ہے۔ اس نظام میں سیاسی، معاشی، سماجی اور مذہبی طاقت کو ذاتی و گروہی مفادات کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ چناں چہ زمین کا مالک حکمران ہوتا تھا۔ چوں کہ اس دور میں ''زمین'' ہی پیداوار کا بنیادی عامل تھی۔ اس لیے ''زمین'' سے پیدا ہونے والی تمام اشیا کا مالک حکمران

www.rahimia.org

ہوتا تھا۔ کسان اور کاشت کار کو محنت کا معاوضہ صرف ''اُجرت'' کی صورت میں دیا جاتا تھا اور اس میں سے بھی انھیں بطور ''لگان'' مالک کو اپنی محنت کے معاوضے میں سے بہت بڑا حصہ ادا کرنا ہوتا تھا۔

اس زمانے میں کسانوں کے لیے ''سرف'' (Serf) کا لفظ استعمال ہوتا تھا۔ یہ لوگ زمین کی طرح ایک بکنے والی شئے تھے اور زمین کا حصہ شمار ہوتے تھے۔ ایک دھرتی پر رہنے والے یہ لوگ نسل در نسل بکتے رہتے تھے۔ ان کی قیمت عام جانوروں سے بھی کم تر تھی۔

ان سرفوں کی چند قسمیں تھیں:

- ☆ بورڈرز (Bordars): یہ محل اور جاگیر میں ملازمت کرتے تھے۔ انھیں گزارے کے لیے گاؤں کے آس پاس دو تین ایکڑ زمین دے دی جاتی تھی۔
- ☆ کاٹرز (Cotters): ان کو جاگیر پر محض ایک جھونپڑی بنا کر رہنے کی اجازت تھی۔
- ☆ ولین (Villeins): ان کو کرائے پر زمینیں لینے کا اختیار تھا اور ان زمینوں کا لگان ادا کرنا پڑتا تھا۔

فیوڈل اِزم میں مذہب کا کردار

یورپ کا مذہبی کلیسا' ہمیشہ فیوڈل لارڈز کا نہ صرف اتحادی رہا، بلکہ رفتہ رفتہ خود مذہبی کلیسا نے بھی یورپ کے سب سے بڑے جاگیردار کی شکل اختیار کرلی۔ اس طرح یورپ کی نصف سے زیادہ زمینیں چرچ کی ملکیت بن گئیں۔ جیسے فیوڈل لارڈز کسانوں کا استحصال کرتے تھے، ایسے ہی چرچ اور کلیسا کے پوپ بھی محنت کشوں کی کمائی پر ڈاکہ ڈالتے تھے۔

(2) مرکنٹائل اِزم (Mercantilism)

یورپ میں فیوڈل اِزم کے بعد کا دور مرکنٹائل اِزم کہلاتا ہے، جو سولھویں صدی کے وسط سے شروع ہو کر سترہویں صدی کے اختتام تک جاری رہا۔ یورپ میں زرعی دور کی ترقیات کے بعد جب تجارتی عمل کو فروغ حاصل ہوا تو ''زر'' کے ارتکاز نے ''تجارتی نظریۂ زر'' کو فروغ دیا۔ جس کے نتیجے میں ''مرکنٹائل اِزم'' وجود میں آیا۔ گویا ''تبادلہ اشیا'' کا ایک ایسا طریقۂ کار وجود میں آیا، جس میں ''اشیا'' کے بجائے ''زر'' کو مرکزی حیثیت حاصل ہوگئی۔ جیسے زرعی دور میں ''زمین'' مرکزی اور محوری حیثیت رکھتی تھی، اسی طرح تجارتی دور میں ''زر'' کو مرکزی اور محوری حیثیت حاصل ہوگئی۔ تمام پیداواری رشتے اور تجارتی تعلقات کا محور ''زر'' بن کر رہ گیا۔ جن لوگوں کے قبضے میں زر اور تجارت کا کنٹرول تھا، انھوں نے ہی انسانوں کی محنتوں کا استحصال شروع کرلیا اور خرید و فروخت کے ایسے طریقے وضع کیے، جس سے زیادہ سے زیادہ زر اکٹھا ہو سکے۔ اسی کو تجارتی نظریۂ زر کہا جاتا ہے۔

تجارت کا فطری نظام یہ ہے کہ پیداشدہ اشیا کا تبادلہ انسانوں کے مفاد کے لیے کیا جاتا ہے۔ انسانوں کو چوں کہ ''حاجات'' پیش آتی ہیں اور ''اشیا'' حاجات کی تسکین کا باعث بنتی ہیں، اس لیے اشیا کا تبادلہ تعاونِ باہمی کے لیے ناگزیر قرار پایا۔ اب اس تبادلے کی عموماً چند شکلیں ہیں: پہلی صورت یہ ہے کہ اشیا کا اشیا سے تبادلہ کیا جائے۔ دوسری یہ کہ ''اشیا'' فروخت کر کے ''زر'' حاصل کیا جائے اور پھر اُس ''زر'' کے ذریعے اپنی ضرورت کی ''اشیا'' خریدی جائیں۔ تبادلے کی ان دونوں شکلوں میں خریدار اور

www.rahimia.org

فروخت کنندہ اپنی اپنی اشیا کی خرید و فروخت کر کے اپنی احتیاجات کی تسکین کا سامان کرتا رہا ہے۔ اس تمام تر خرید و فروخت اور تبادلہ اشیا کا مقصد انسانی احتیاجات کے لیے اشیا کا حصول تھا، لیکن مرکنٹائل اِزم میں زر سے زر حاصل کرنے کے لیے اشیا کو واسطہ بنا لیا گیا۔ یعنی اصل مقصد انسانی احتیاجات کی تسکین کے لیے اشیا کا مہیا کرنا نہیں رہا، بلکہ محض زراندوزی مقصد قرار پایا۔ اور جب زر کا حصول ہی تجارت کا مقصد قرار پایا تو انسانی محنتوں کے استحصال کی مختلف عملی شکلیں سامنے آئیں۔ اس طرح فیوڈل اِزم کی جگہ مرکنٹائل اِزم کی صورت میں ظلم و ستم کا بازار گرم ہوگیا۔

مرکنٹائل اِزم کے اس بنیادی تصور کو سمجھنے کے لیے تبادلہ دولت کا درجِ ذیل چارٹ پیشِ نظر رہنا چاہیے:

1	اشیا	---	اشیا
2	اشیا	زر	اشیا
3	زر	اشیا	زر
4	زر	---	زر

اس طرح مرکنٹائل اِزم میں اشیا کی خرید و فروخت انسانی احتیاجات کی تسکین کے نقطہ نگاہ سے کرنے کی بجائے محض زر سے زر کمانے پر ہوتی ہے۔ اس طرح زر پر قابض طبقات نے اشیا کے پیداواری عمل کو بھی زر کے مفادات کے مطابق ترتیب دیا اور ''اشیا'' میں ''افادیت'' پیدا کرنے والے محنت کشوں کی محنت کا استحصال شروع کردیا۔ سوسائٹی کا اجتماعی مفاد پسِ پشت چلا گیا اور مخصوص طبقات کی اجارہ داری قائم ہوگئی۔ چناں چہ منڈیوں پر اجارہ داری کے حصول کے لیے دوسری حریف تجارتی طاقتوں اور قوموں کے لیے اپنی منڈیوں میں داخلہ روکنے کا طریقہ اختیار کیا گیا۔ اسی لیے تجارتی نظریۂ زر انسانوں کے مفاد کی عمومی تجارت اور پابندیوں کا نظریہ بھی کہلاتا ہے۔ گویا انسانی مفاد کے مطابق تبادلہ اشیا کی بہترین صورتوں پر پابندی لگا کر طبقاتی مفادات کے لیے کام کیا گیا۔

مرکنٹائل اِزم کے بنیادی اصول

''تجارتی نظریۂ زر'' کے تحت وجود میں آنے والے مرکنٹائل اِزم میں فیوڈل لارڈز کے مقابلے پر ''قومی معیشت'' پر زور دیا گیا، تاکہ زرعی دور میں ''زمین'' سے جڑے فیوڈل لارڈز کا زور توڑا جائے اور قومی معیشت کے نام پر ملکی دولت کو ایک مخصوص تجارتی طبقے کے مفادات کے لیے استعمال میں لایا جاسکے۔ اس کے لیے درجِ ذیل اصول وضع کیے:

1۔ قومی معیشت کے لیے حکومتی سرپرستی کی حوصلہ افزائی۔

2۔ قومی ریاستی طاقت کو بڑھانے کے لیے سونے اور زر کی بیرونِ ملک برآمدگی پر پابندی کے لیے قانون سازی۔

3۔ اشیا کی برآمدات ہر صورت میں ان کی درآمدات سے زیادہ ہونی چاہیے، تاکہ زر ملک کے اندر ہی رہے۔

4۔ اشیا کی پیداوار کے لیے خام مال مہیا کرنے کا کام نوآبادیات کے ذمے لگایا گیا، جب کہ نوآبادیاتی ملکوں میں پیداواری عمل پر پابندی لگادی گئی۔

5۔ جاگیرداروں کو مقروض بنا دیا گیا اور وہ اپنی جاگیریں بیچنے لگے۔

www.rahimia.org

6۔ نوآبادیاتی مقبوضات کی منڈیوں پر قبضہ کر کے برآمدات کی کھپت کی حکمتِ عملی۔

7۔ ہنرمندوں کے مزدور بننے سے تاجروں کے منافع بڑھنے لگے۔

8۔ زر کی حفاظت اور ترقی کے لیے ساہوکار بینکوں کا قیام۔

9۔ زر کی حفاظت کے لیے انشورنس کمپنیوں کا ابتدائی تصور۔

10۔ اشیا کی منڈیوں کے ساتھ زر کی منڈیوں اور مارکیٹوں کا قیام۔

مرکنٹائل اِزم کا ظالمانہ تسلط

یورپ کے ہر ملک نے طاقت ور اور خوش حال بننے کے لیے ان اصولوں پر عمل درآمد کر کے ہر جگہ سے اور ہر ممکن طریقے سے زر حاصل کیا۔ اس مقصد کے لیے بحری جہازوں کے تجارتی بیڑے اور تجارت کے لیے کارکن افراد تیار کرنے شروع کر دیے۔ یورپ کا ہر ملک اس مسابقت میں ایک دوسرے سے آگے نکل جانے کی مہم میں زور وشور کے ساتھ مصروف ہوگیا اور جلد ہی یورپ میں بین الاقوامی تاجروں کا ایک ایسا طبقہ پیدا ہوگیا، جس کی تمام تر اقتصادی منصوبہ بندیاں صرف ''زر'' کی زیادہ سے زیادہ تاجرانہ وسعت پر مبنی تھیں۔

اٹھارہویں صدی عیسوی کے اختتام تک معیشت کا یہ نظام یورپین اقوام کی سیاسی کامیابیوں کے جلو میں پوری دنیا پر چھا گیا۔ ہندوستان سے امریکا تک اور جنوبی افریقا سے جنوبی ایشیا کے دور دراز حصوں انڈونیشیا اور آسٹریلیا تک یورپ کا یہ تاجرانہ جلبِ زر کا نظام پوری طاقت و وسعت کے ساتھ محیط ہوگیا۔ اب وہ اپنے راستے میں کسی قسم کی قانونی پابندی اور رُکاوٹ برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ نیز یہ کہ اُسے اب ایسے مستقل اصول وضوابط کی ضرورت تھی کہ جن کے ذریعے وہ دنیا بھر کی خام اجناس اور کارخانوں کی مصنوعات اُس کے ''نظامِ زر'' کے دائرے میں محصور رہیں۔ بعد میں مشینی صنعت کے جدید عنصر نے ''زر'' کی توسیع کے نئے اور دور رَس امکانات پیدا کر دیے تھے۔ چناں چہ مرکنٹائل اِزم کا دوسو سالہ اقتصادی و معاشی نظام کیپٹل اِزم میں تبدیل ہونا شروع ہوگیا۔ (30)

(3) کیپٹل اِزم (Capitalism)

یورپ میں مرکنٹائل اِزم کے بعد کا مرحلہ ''کیپٹل اِزم'' کا ہے۔ مرکنٹائل دور میں ''زر'' کے ارتکاز نے صنعتی ایجادات کو اپنے قبضے میں لے لیا۔ چناں چہ اگر پہلے ''زر'' سے ''زر'' کمانے کے لیے ''اشیا'' واسطہ بنتی تھیں اور ہنرمند مزدوروں کے ہاتھ اشیا بناتے تھے تو صنعتی دور میں ''مشین'' کو زیادہ سے زیادہ اشیا پیدا کرنے کا ذریعہ بنا لیا گیا۔ اس پیداواری عمل میں مزدور کی بجائے مشین اور صنعت کو استعمال کر کے زیادہ سے زیادہ نفع اندوزی کے لیے ''اشیا'' پیدا کی گئیں۔ اس طرح مرکنٹائل دور کا یہی مرتکز شدہ ''زر''، صنعتی دور میں ''کیپٹل'' کی شکل اختیار کر گیا۔ اس دور میں ''زمین'' اور اس سے حاصل شدہ خام مال، زر اور مشین نے مل کر ایک ''اثاثے'' (Asset) کی شکل اختیار کر لی، جسے ''کیپٹل'' کہا گیا۔ اب تمام پیداواری رشتے ''کیپٹل'' کو محوری حیثیت دے کر وجود میں لائے گئے۔ اس طرح ''سرمایہ'' کے پھیلاؤ اور اس کے فروغ کے حربے اپنائے جانے لگے اور انسان کو لوہو کے

www.rahimia.org

بیل کی طرح ''کیپٹل'' کے گرد گھومنے لگا۔ چناں چہ ''کیپٹل'' کی اساس پر پیدائش دولت، تقسیم دولت، تبادلہ دولت اور صَرفِ دولت کے اصول و ضابطوں کا نظام وجود میں آیا۔

کیپٹل اِزم کا تاریخی پس منظر

کیپٹل اِزم کی بنیاد ایڈم سمتھ (Adam Smith) نے رکھی۔ چناں چہ اس نے 1776ء میں ایک مستقل تصنیف ''دولتِ اقوام''(The Wealth of Nations) میں ''کیپٹل اِزم'' کا باقاعدہ نظریہ اور اصول اور اس کے ضابطے پیش کیے۔

ایڈم سمتھ نے سب سے پہلے تو تجارت پر سے اُن تمام مقامی پابندیوں کو ہٹانے کی تجویز سامنے رکھی، جو یورپ کے مختلف ممالک نے اپنے اپنے ملکوں میں سامانِ تجارت کی درآمد و برآمد پر لگا رکھی تھیں اور پھر فری ٹریڈ اِزم کے اصول پر تجارت کے نئے نظام کا نظریہ پیش کیا۔ جس کی رُو سے ہر علاقے کو زیادہ سے زیادہ ارزاں قیمت پر اپنے علاقے کی اشیا تیار کرنی چاہئیں اور دوسری قوموں کی تیار کردہ اشیا سے آزادی کے ساتھ تبادلے کی اجازت حاصل کرنی چاہیے۔ نیز تجارت وصنعت کی تمام منصوبہ بندیاں ''سرمایہ'' کے بل پر کی جانی چاہئیں اور سرمایہ کاری انفرادی ملکیت(Private Ownership) کے اصول پر ہونی چاہیے، جو ''صَرف''(Consomption) کی اساس پر پھیل اور بڑھ سکے اور پھر فری ٹریڈ اِزم کا تاجرانہ اقتصادی نظام اٹھارہویں صدی میں کیپٹل اِزم کی صورت اختیار کر گیا، جو آگے چل کر مشینی صنعت کے فروغ کے ساتھ صنعت وتجارت کے مشترکہ، وسیع اور ہمہ گیر سرمایہ کارانہ لوٹ کھسوٹ کے نظام کی شکل میں سامنے آیا۔ جس کے دباؤ اور کنٹرول میں جلد ہی دنیا بھر کی زرعی، معدنی اور صنعتی پیداواریں آ گئیں۔

اس طرح دولت اور معیشت کا تمام انحصار پیدائش دولت، تبادلہ دولت اور تقسیم دولت اور صرفِ دولت کی صورت میں ہونے لگا۔ کاشت کار اور مزدور کی محنت پیداوار کا اوّلین اور مؤثر ترین عنصر ہونے کے باوجود سرمایہ دارانہ نظامِ معیشت میں بے اثر اور غیر اہم بنا کر رکھ دی گئی۔ سرمایہ کاری کے عمل میں دولت کی اس گردش، اس سے حاصل ہونے والے اضافہ اور کمی کے مسائل ہی معیشت کے اصل مسائل قرار دیے گئے۔ اور ''قدر''(Value) کا مقام صرف سرمائے کو حاصل ہو گیا۔

سرمایہ داری نظام کے اصول ونظریات

سرمایہ داری نظام کے اپنے چند بنیادی اساسی اصول ونظریات مندرجہ ذیل ہیں:

1۔ عاملین پیدائش دولت اور تقسیم دولت کی بحث اور ''سرمایہ'' کی بنیادی حیثیت

سرمایہ داری کا پہلا بنیادی اصول ''سرمایہ'' کو بنیادی عامل پیدائش قرار دینا ہے۔ اس کی حقیقت سمجھنے کے لیے عاملین پیدائش دولت کی بحث کو سمجھنا ضروری ہے۔ عام طور پر سرمایہ دارانہ نظام میں چار عاملین پیدائش دولت گنوائے جاتے ہیں:

1۔ زمین (Land)
2۔ محنت (Labour)
3۔ سرمایہ (Capital)
4۔ تنظیم (Orgnization)

سرمایہ دارانہ نظامِ معیشت میں بظاہر پیداوار کے حوالے سے یہ تمام عوامل حصہ لیتے ہیں، اس لیے پیداوار کو ان کے درمیان

www.rahimia.org

ایک خاص تناسب کے ساتھ تقسیم ہونا چاہیے۔ یعنی بقول ان کے پیداوار کا ایک حصہ زمین کا نکالا جائے گا، جسے لگان (Rent) کا نام دیا گیا ہے۔ دوسرا حصہ محنت کا اُجرت کی شکل میں ہوگا اور تیسرا حصہ سرمائے کا سود (Interest) کی شکل میں منہا کیا جائے گا اور چوتھا حصہ آرگنائزر یا آجر کا منافع (Profit) پرافٹ کی شکل میں لیا جائے گا۔ اس طرح بادی النظر میں یہ بتلانے کی کوشش کی جاتی ہے کہ دیکھئے ہم نے کس طرح پیداوار کو تقسیم کر کے ارتکازِ دولت کو روک رکھا ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان تمام عوامل میں مرکزی اور بنیادی حیثیت سرمائے کو حاصل ہے۔ اس کے ذریعے سے جس طرح انسانیت کی محنت کا استحصال کیا جاتا ہے' وہ لائق صد نفرین ہے۔

عاملین پیدائش دولت کا تحلیل و تجزیہ

بات یہ ہے کہ ''زمین'' ایک قدرتی چیز ہے اور جب تک اس پر کسی کا قبضہ نہ ہو، وہ ''زمین'' کی تعریف میں رہتی ہے، لیکن جب کسی نے اُسے اپنے قبضے میں لے لیا اور اس پر محنت کر کے استعمال کے لیے تیار کرلیا، تو وہ معاشیات کی اصطلاح کے مطابق ''زمین'' کی تعریف سے نکل کر ''سرمایہ'' کی تعریف میں داخل ہوگئی۔ ایسی صورت میں زمین' سرمائے کے وجود میں ضم ہوکر اپنا وجود مستقل طور پر کھو بیٹھی ہے۔ اس لیے قدرتی زمین سے کسی انسان کا ''لگان'' وصول کرنا' اصولِ معاشیات کے اعتبار سے غلط ہوا۔ کیوں کہ اس پر تمام لوگ متفق ہیں کہ قدرتی وسائل قدرتی حالت میں کسی انسان کی انفرادی ملکیت میں داخل نہیں ہیں، بلکہ مالِ مباح کی حیثیت سے وہ تمام انسانوں میں مشترک ہیں۔ ملکیت کا سوال پیدا ہی اس وقت ہوتا ہے، جب اس مادے میں کسی بھی نوع کی افادیت پیدا کر دی جائے۔ مثلاً جنگل کی لکڑی انفرادی ملکیت سے ماورا ہے۔ ایک انسان جب اس پر قبضہ کر کے گھر لے آیا تو اس نے اس میں افادیت پیدا کردی۔ لہٰذا اب اس کی ملکیت کا سوال پیدا ہوگا۔ اسی طرح دریا میں پانی انفرادی ملکیت سے ماورا ہے۔ جب کوئی آدمی وہاں سے نہر کاٹ کر لاتا ہے یا مٹکے میں بھر کر لاتا ہے تو پھر ملکیت کا سوال اُبھرے گا۔ اس سے قبل نہیں۔ لہٰذا جس چیز کی ملکیت ہی ثابت نہیں ہوئی، اس کا لگان یا کرایہ وصول کرنا چہ معنی دارد!!!

جہاں تک تنظیم کا تعلق ہے، وہ بھی حقیقت میں ''محنت'' کا ہی ایک حصہ ہے۔ اگر چہ وہ دماغی یا منصوبہ بندی کی محنت ہے، جیسا کہ ''ماہرین اقتصادیات کا ایک بہت بڑا گروہ ''منافع'' کو کاروباری قابلیت استعمال کرنے کی ''اُجرت'' تصور کرتا ہے۔''(31) اس طرح تنظیم بھی الگ سے عامل پیدائش دولت ہونے کے بجائے ''محنت'' کا ہی ایک حصہ ہے۔

اس طرح سرمایہ دارانہ نظام کے ماہر محققین کے نزدیک عوامل پیدائش دولت بنیادی طور پر دو ہیں: 1۔ لیبر یعنی دماغی محنت و جسمانی محنت اور 2۔ دوم کیپٹل یعنی سرمایہ۔ خواہ وہ کسی بھی شکل میں ہو۔ سرمایہ دارانہ نظام کے اعتبار سے اس کا مطلب یہ ہے کہ کسی معاشی کاروبار میں بطور نفع جو دولت حاصل ہوتی ہے، وہ محنت اور سرمایہ دونوں کے عمل سے پیدا شدہ ہوتی ہے۔ اور دونوں کا اس میں حصہ ہوتا ہے۔ لہٰذا گر کسی کاروبار میں ایک کا کسی شکل میں سرمایہ اور دوسرے کا کام و عمل تھا تو دونوں کو پیدا شدہ دولت میں سے حصہ ملنا چاہیے۔ یعنی وہ پیدا شدہ دولت دونوں کے درمیان تقسیم ہونا ضروری ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ عوامل پیدائش کے متعلق مذکورہ تصور کی وجہ سے نظامِ سرمایہ داری میں کاروبار اور معاشی معاملات کی وہ تمام شکلیں قانونی طور پر جائز قرار پاتی ہیں، جن میں

www.rahimia.org

ایک کا کسی نہ کسی شکل میں محفوظ سرمایہ ہوتا اور دوسرے فریق کا دماغی جسمانی معاشی کام و عمل ہوتا، اور حاصل شدہ نفع میں دونوں حسبِ معاہدہ حق دار قرار پاتے ہیں۔ حتیٰ کہ تجارتی نوعیت کے قرضوں پر سود کا لین دین بھی قانوناً جائز ٹھہرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس نظامِ سرمایہ داری کے ماننے والے کبھی اس پر بحث نہیں کرتے کہ ''نفسِ سود'' جائز ہے یا نہیں، بلکہ وہ اگر بحث کرتے ہیں تو اس پر کہ کن حالات میں سود کی شرح کتنی ہونی چاہیے۔ کیوں کہ یہ تسلیم کر لینے کے بعد کہ سرمایہ بھی دولت کو پیدا کرتا ہے، عقلاً اس بحث کی کوئی گنجائش نہیں رہتی کہ پیدا آور مقاصد کے قرضوں پر سود لینا دینا جائز ہے یا نہیں۔

اب عاملین پیدائش دولت کے میدان میں صرف ''محنت'' اور ''سرمایہ'' رہ جاتے ہیں۔ اس صورت میں چوں کہ سرمایہ دار مضبوط فریق ہوتا ہے، اس لیے محنت کشوں کو مجبور کر کے کم سے کم قیمت پر رضامند کر لیتا ہے، جو درحقیقت رضامندی نہیں ہوتی، بلکہ ان کی مجبوری ہوتی ہے۔ کیوں کہ انھیں پتہ ہوتا ہے کہ اگر آج محنت نہ کی تو کل کھائیں گے کہاں سے؟ اس لیے مجبوراً وہ کم مزدوری پر تیار ہو جاتے ہیں۔ اس طرح گویا سرمایہ دار اپنے راستے سے سب کو ہٹا کر اور ''سرمائے'' کو بنیادی عامل پیدائش قرار دے کر نام نہاد ''منافع'' اور اصل میں ''سرمایہ'' کا عوض ''سود'' وصول کرتا ہے۔

پھر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ سرمایہ دارانہ نظریۂ معیشت میں جو ''نظریۂ تقسیم'' (Theory of Distribution) پیش کیا جاتا ہے تو وہ بھی کسی ایسے مستقل اور سائنٹفک اصول و ضابطے پر مبنی نہیں ہے، جس کی بنیاد پر دوٹوک طریقے سے یہ کہا جا سکے کہ فلاں عامل کا حصہ اس قدر ہے۔ جتنے نظریات بھی پیش کیے گئے ہیں، وہ ناقص ہیں۔ اگر علمی طور پر بعض میں وزن ہو بھی تو عملاً وہ سرمایہ دار کے تسلط کی وجہ سے بے کار نظر آتا ہے۔

2۔ لامحدود انفرادی ملکیت

سرمایہ دارانہ نظام کا دوسرا بنیادی اصول ''ذرائع پیداوار'' اور ''دولت'' کی لامحدود انفرادی ملکیت ہے۔ اس اصول کے تحت ہر انسان کو یہ حق ہے کہ وہ جیسے چاہے کمائے اور جتنی چاہے ملکیت بنائے۔ خواہ اس آزادی اور ملکیت کے نتیجے میں قوم کے حقوق غصب ہو رہے ہوں یا وہ تباہی کے کنارے پر پہنچ جائے۔ اسے اس سے کوئی غرض نہیں ہے۔ ملک کے تمام اثاثہ جات کا تعلق ''سرمایہ'' کے ساتھ وابستہ ہو جاتا ہے۔ لامحدود انفرادی ملکیت سے پورے ملک کے اثاثہ جات چند طبقات کے قبضے میں آ جاتے ہیں۔

سرمایہ دارانہ نظام میں اس اصول کا استعمال جس بے دریغ طریقے سے کیا گیا ہے اور پھر اس کے نتیجے میں انسانیت کے لیے جو مفاسد پیدا ہوئے ہیں، وہ انتہائی غلط نوعیت لیے ہوئے ہیں۔ من جملہ دیگر مفاسد کے اس اصول کے تحت سب سے بڑا فساد یہ ہے کہ اس طرح ملکی سیاسی اور معاشی نظام پر جاگیرداروں اور سرمایہ داروں کا قبضہ ہو جاتا ہے۔ چناں چہ جب بھی ان کے مفادات پر زد پڑتی ہے تو یہ لوگ اپنی اسی نام نہاد انفرادی ملکیت کے بل بوتے پر حکومت میں تبدیلیاں پیدا کرتے ہیں اور صحیح قوانین کے بننے میں آڑے آتے ہیں۔

دوسری بڑی خرابی یہ ہے کہ ساری قوم ان چند مٹھی بھر سرمایہ داروں کے رحم و کرم پر ہو جاتی ہے، جو لامحدود ملکیت کے مالک ہوتے ہیں۔ مثلاً کوئی سرمایہ دار کسی ملک کی ریلوے اپنے سرمائے کے بل بوتے پر خرید لے یا کوئی اور ایسی بنیادی صنعت کہ جس

www.rahimia.org

کے اثرات پوری قوم پر پڑتے ہوں۔ جب بھی یہ سرمایہ دار کسی ذاتی مفاد یا بین الاقوامی اشاروں پر ملک کا پہیہ جام کرسکتا ہے۔ اور جب جی چاہا بنیادی صنعت کو روک کر پوری قوم کا دیوالیہ نکال دیا۔ چناں چہ اسی انفرادی ملکیت اور حد سے بڑھی ہوئی آزادی کا نتیجہ تھا کہ برصغیر پاک و ہند تقریباً ڈیڑھ سو سال ایک سرمایہ دار ایسٹ انڈیا کمپنی کے زیر تسلط رہا۔

3۔ آزاد مسابقت

سرمایہ دارانہ نظام کا تیسرا بڑا اصول ''آزاد مسابقت'' یا مقابلہ ہے۔ یعنی ہر انسان یا کمپنی کو اجازت ہے کہ وہ آزادانہ طریقے پر ایک دوسرے سے مقابلہ کر کے اپنی ''دولت'' میں اضافہ کرلیں۔ یہ مسابقت' تیار شدہ مال کو فروخت کرنے اور دولت کو زیادہ سے زیادہ وسعت دینے کے لیے سرمایہ دارانہ نظام میں ایک اکسیر کی حیثیت رکھتی ہے، لیکن اگر اس کی تباہ کاریوں پر نظر ڈالی جائے تو شاید ہی اس اصول کو اپنی تمام تر خرابیوں کے ساتھ کوئی عقل مند آدمی جائز قرار دے۔ کیوں کہ اس اصول کے نتیجے میں جدید سرمایہ داری ''اجارہ داری'' کی طرف بڑھتی ہے۔ اس کی صورت یہ ہوتی ہے کہ بعض اوقات ایک ہی صنعت میں دو حریف برسر مقابلہ ہوتے ہیں۔ پھر ان میں سے کوئی ایک اپنے تمام حریفوں پر غالب آجاتا ہے اور اس خاص شعبۂ صنعت پر اپنی اجارہ داری قائم کرلیتا ہے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ بہت سے برسرِ مقابلہ حریف آپس کی رقابت کے نقصان کو محسوس کر کے باہمی اشتراکِ عمل کرلیتے ہیں، جس سے بہت سے صنعتی ادارے آپس میں متحد ہوجاتے ہیں، لیکن اس اتحاد میں کمزور اداروں اور کمپنیوں کا انفرادی وجود عملاً ختم ہوکر رہ جاتا ہے۔ پھر ان میں سے جو ادارہ یا کمپنی طاقت ور اور بااثر ہوتی ہے' وہ ساری صنعت پر چھا جاتی ہے اور دوسرے اداروں کے تمام مالی اور انتظامی اختیارات سلب کرلیتی ہے۔ اس طرح جب متعدد صنعتوں پر ایک یا دو اداروں کی اجارہ داری قائم ہوجاتی ہے تو وہ اپنی تیار کردہ اشیا کی قیمتیں بڑھا دیتے ہیں اور چوں کہ اس صنعت کے میدان میں ان کا کوئی حریف یا مقابل نہیں ہوتا، اس لیے وہ اپنی بڑھائی ہوئی قیمتوں پر مال فروخت کرنے میں کامیاب ہوجاتے ہیں۔ اس طرح آزاد مسابقت کا یہ اصول باطل ہوجاتا ہے اور افراد کی تجارتی، صنعتی اور معاشی آزادی کو سلب کرلیتا ہے۔ (32) اس طرح عملی طور پر آزاد مسابقت (Free Competition) کبھی وجود میں نہیں آتی۔

4۔ طلب اور رَسد کی بنیاد پر قیمتوں کا تعین

سرمایہ دارانہ نظام کا چوتھا بڑا اصول یہ ہے کہ ''طلب'' و ''رسد'' کے عمل اور ردِّ عمل کی وجہ سے ''اشیا'' کی قیمتوں کا تعین سرمایہ داروں کے رحم و کرم پر ہوتا ہے۔ سرمایہ دارانہ نظام میں کہنے کو تو یہ کہا جاتا ہے کہ ''طلب و رسد'' کا عمل اور ردِّ عمل ہی قیمتوں کے تعین کے لیے کافی ہے۔ سرمایہ داری کے حامیوں کا دعویٰ ہے کہ قیمتوں کے تعین کا یہی فطری طریقہ ہے۔ کیوں کہ اس میں مصنوعی طریقے سے کسی شئے کی قیمت مقرر نہیں کی جاتی اور نہ کسی خارجی طاقت کا استعمال کیا جاتا ہے، لیکن حقیقت میں ایسا نہیں ہے، بلکہ مصنوعی طلب اور مصنوعی رسد کے ذریعے سے قیمتوں کے تعین کے اس نظام پر سرمایہ داروں کا تسلط ہوتا ہے۔

ظاہری طور پر تو شاید طلب و رَسد کی بنیاد پر قیمتوں کے تعین کا اصول بڑا فطری نظر آئے، جیسا کہ سرمایہ داری کے حامیوں کا کہنا ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ محض اس بنیاد پر قیمتوں کے تعین کا نظام انتہائی غیر معقول ہے۔ وجہ یہ ہے کہ اس طرح قیمتوں کے

www.rahimia.org

تعین میں بڑی خرابیاں ہیں۔ فرض کیا کہ ایک شئے پر دس روپے لاگت آئی ہے۔ اب اس کی قیمت اس اصول کی رُو سے بازار میں طلب و رسد کے پیمانے سے متعین ہوگی تو بسااوقات تو یہ ہوتا ہے کہ رسد کی قلت اور طلب میں اضافے کی وجہ سے قیمتیں بڑھ جاتی ہیں۔ اس صورت میں دس روپے میں تیار شدہ چیز 20 روپے، بلکہ اس سے بھی زیادہ پر فروخت ہوسکتی ہے، لیکن اگر طلب میں کمی آجائے اور رسد میں اضافہ ہوجائے، (یہ عموماً ہوجاتا ہے۔ کیوں کہ آزاد مسابقت کے اصول پر ہر ایک کو وہ شئے تیار کرنے اور مقابلہ کرنے کی اجازت ہوتی ہے۔) اس کے نتیجے میں قیمتیں گر جاتی ہیں۔ اس صورت میں وہی شئے جس پر دس روپے لاگت آئی تھی، مارکیٹ میں مثلاً آٹھ روپے یا اس سے بھی کم پر فروخت ہوجاتی ہے۔ پہلی صورت میں تیارکنندہ اور سٹاک کنندہ کی چاندی ہوتی ہے اور اگر منافع کی شرح کسی طرح سو فی صدی ہوجائے تو پھر تو اور وارے نیارے ہوجاتے ہیں۔ دوسری صورت میں فروخت کنندہ کو پوری قیمت بھی وصول نہیں ہوتی اور اس طرح اُسے فائدے کے بجائے اُلٹا نقصان اٹھانا پڑ جاتا ہے، لیکن چوں کہ رسدی مال کے مالک عموماً بڑے سرمایہ دار لوگ ہوتے ہیں، اس لیے اس ''جوئے'' میں یہ لوگ ذخیرہ اندوزی کرکے رسد کی مصنوعی قلت پیدا کردیتے ہیں۔ اور ادھر غلط قسم کی اشتہار بازی کرکے ''طلب'' میں اضافہ کردیتے ہیں۔ اس طرح قیمتوں کا توازن اپنے حق میں رکھتے ہیں اور صارفین کا دن بدن استحصال کرتے رہتے ہیں۔

اور پھر اس اصول کا افسوس ناک پہلو وہ ہے جو ''اسٹاک ایکسچینج'' کے نام پر کھیلا جاتا ہے۔ محض فرضی وسوسوں اور اندیشوں کی بنا پر یہ لوگ جب چاہیں منڈی کی قیمتوں میں اضافہ کرادیں اور جب چاہیں کمی کرادیں۔ اور پھر ان لوگوں کا کاروبار تو سراسر سٹے بازی پر چلتا ہے اور بالکل فرضی کاروبار ہوتا ہے۔ اصل صنعت اور دوسرے محنت کرنے والے افراد سے انھیں کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ خواہ صنعت تباہ ہو یا مہنگائی سے صارفین کی کمر دُہری ہورہی ہو۔ انھیں اس سے کوئی غرض نہیں۔ انھیں تو بس اپنی دلالی یا سٹے بازی سے منافع کے نام پر ''سود'' چاہیے۔ اس طرح یہ لوگ صارفین کا خون چوس کر پلتے رہتے ہیں اور قوم کو تباہ کرتے رہتے ہیں۔

اس اصول کی وجہ سے ''تجارتی چکر'' کی تباہ کاریاں

سرمایہ دارانہ نظام کے اس اصول کی وجہ سے ایک اور خرابی جو اس کی جڑوں کو کھوکھلا کردیتی ہے، وہ ''تجارتی چکر'' ہے، جس کا اثر بے روزگاری کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے۔ تفصیل اس کی یہ ہے کہ چوں کہ یہ نظام آزاد مسابقت پر مبنی ہے، اس لیے ایک ہی صنعت میں متعدد حریف برسرِ مقابلہ ہوتے ہیں۔ ''طلب'' میں اضافہ ہونے کے ساتھ ہی ہر حریف کارخانہ دار کی یہ کوشش ہوتی ہے کہ وہ پیداوار میں جلد از جلد اور زیادہ سے زیادہ فائدہ حاصل کرکے دوسروں پر سبقت لے جائے۔ اس طرح پیداوار کی کثرت ہوجاتی ہے۔ اور طلب و رسد میں توازن نہیں رہتا۔ اشیائے مطلوبہ کی ایک کثیر مقدار کو ''بازار'' میں فروخت کرنا ایک امر دشوار بن جاتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ رسد میں غیر معمولی اضافے کے باعث قیمتیں تیزی سے گرنے لگتی ہیں اور جیسے ہی یہ عمل شروع ہوتا ہے، ہر کارخانہ دار یہ کوشش کرتا ہے کہ جلد سے جلد پیداوار میں تخفیف کردے۔ جب یہ صورت پیدا ہوتی ہے تو بڑی تعداد میں کارخانے بند ہونے لگتے ہیں۔ مزدوروں کی ایک بڑی اکثریت بے کار ہوجاتی ہے اور منڈیوں کی گرم بازاری اچانک سرد بازاری میں تبدیل ہوجاتی ہے۔ یہ عمل جسے ''تجارتی چکر'' کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے اور جس میں کثرتِ پیداوار کے باعث بالآخر سرد بازاری پیدا ہوتی ہے، سرمایہ دارانہ معیشت کا ایک بڑا روگ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس ''روگ'' کو ختم کرنے کے لیے سرمایہ دار

www.rahimia.org

قیمتوں کے توازن کو اپنے حق میں برقرار رکھنے کے لیے اپنی زائد پیداوار کو سمندر بُرد بھی کر دیتے ہیں۔ تاکہ کہیں غریب صارفین ان ''پیدا شدہ'' اشیا کو سستے داموں نہ خرید لیں۔

سرمایہ دارانہ نظامِ معیشت کے یہ وہ بنیادی اور اساسی اصول ہیں کہ جن پر اس نظام کا بنیادی اسٹرکچر قائم ہے۔ ان اصولوں کے آئینے میں سرمایہ داری نظام کا چہرہ بخوبی دیکھا جاسکتا ہے اور یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ انسانی زندگی کے ارتقا اور تحفظ کے بارے میں اس نظام کا کردار ہمیشہ منفی رہا ہے۔ چناں چہ جس جگہ بھی یہ نظام مسلط ہوا' وہاں اس نے انسانیت کے ہر شعبۂ زندگی کو اپنے استحصال کی لپیٹ میں لے لیا۔ اس حوالے سے حضرت مولانا حفظ الرحمٰن سیوہارویؒ لکھتے ہیں: سرمایہ داری کے اس سسٹم میں مفادِ عامہ اور عوام کی فلاح و بہبود کا کوئی سوال ہی نہ تھا، بلکہ ذرائع پیداوار کی نجی ملکیت سے ناجائز فائدہ اٹھا کر تمام ذرائع پیدائش کو اپنے ذاتی مفاد کے لیے خاص کر لیا جاتا تھا۔ اس لیے فیکٹریوں اور مشینوں میں جو سامان تیار ہوتا تھا، وہ کم سے کم اجرت دے کر زائد سے زائد مال تیار کرانے اور ذاتی فائدہ حاصل کرنے کے اصول پر عالم وجود میں آتا تھا۔

سرمایہ داری کے اس بھوت نے دوسرے ممالک پر لالچ اور حرص و آز کی نگاہ ڈالنی شروع کر دی اور ''ہل من مزید'' پکارتے ہوئے ان کو محکوم بنانے کے لیے قدم آگے بڑھایا اور اپنی جوع الارض.... (زمین کی بھوک) کو پورا کرنے کے لیے اپنی صنعتوں کے آزاد کاروباری لوگوں کو غلام بنانے کے بعد کمزور ملکوں اور قوموں کو غلام بنانا شروع کر دیا اور اٹھارویں انیسویں صدی میں افریقا جیسے براعظم میں یورپین نوآبادیات کا سلسلہ شروع ہو گیا اور ہندوستان جیسا بڑا ملک بھی آخر اسی استعمار کی نظر ہو گیا۔ اور اس طرح تھوڑے سے عرصے میں ساری دنیا ایک طرح انگلستان کے سرمایہ داروں کی خصوصاً اور دوسری سرمایہ دار طاقتوں کی عموماً تجارتی منڈی بن گئی۔

ذرائع پیدوار کو مخصوص طبقے کی ذاتی ملکیت قرار دینے اور عوام کی بہبودی سے قطع نظر ان کی پیدوار کو نجی اور انفرادی مفاد کی بھینٹ چڑھا دینے کا یہ سسٹم اب بھی مطمئن نہیں ہے اور اب خود آپس میں دست بہ گریباں نظر آتا ہے۔ ہر ایک ملک اپنی اس تجارتی دوڑ میں ایک دوسرے سے آگے جانا چاہتا ہے اور اس دوڑ میں آزاد قوموں کو غلام بنانے، تباہ و برباد کرنے اور صفحۂ دنیا سے مٹا دینے کو بھی اپنا جائز حق تصور کرتا ہے۔ جرمنی، اٹلی، انگلستان، فرانس، جاپان، امریکہ وغیرہ فاشسٹ حکومتوں کی اس مسابقت نے دنیا بھر کے ممالک کا بُرا حشر کیا ہوا ہے۔[33]

(4) سوشلزم (Socialism)

یورپ میں صنعتی دور میں پیدا ہونے والے ''کیپٹل اِزم'' نے انسانیت پر مظالم کے پہاڑ توڑے تو اس کے ردّ عمل میں یہ سوچا جانے لگا کہ ''تجارتی نظریۂ زر'' اور ''کیپٹل'' کی بجائے انسانی بنیادوں پر صنعتی دور کی نئی سماجی ترتیب و تنظیم ہونی چاہیے۔ اس طرح سوچ و بچار سے یورپ کے صنعتی دور میں سوشلزم کا فکر اور اس کے اصول وجود میں آئے۔ سوچا یہ گیا کہ ''زر'' اور ''سرمایہ'' کے برعکس ''انسانی سوسائٹی'' کو اہمیت دی جائے۔ اس لیے ''سوشل'' یعنی اجتماعیت کو بنیاد بنا کر معاشی نظام تشکیل دینے کا تصور سامنے آیا۔ پھر قومی ریاست میں ''اجتماعیت'' کی صورت گری ریاستی طاقت سے ہوتی ہے۔ اس لیے فرد کی بجائے ''ریاستی طاقت'' کو اصل قرار دے کر تمام معاشی پیداواری رشتے وجود میں لانے کا جو نظام تشکیل دیا گیا، اسے ''سوشلزم'' کہا جاتا ہے۔ یہ

www.rahimia.org

بھی ایک مستقل نظام ہے۔ عربی اور اردو زبانوں میں اسے ''اشتراکیت'' کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ یہ نظام جیسا کہ معنی سے ظاہر ہے، سوشلزم یعنی ''سماجی فلاح و بہبود کا نظام'' کہلاتا ہے۔

سوشلزم کا تاریخی پس منظر

ایڈم سمتھ کے کیپٹل اِزم کے نظریے نے معاشی استحصال کا وسیع ترین دروازہ کھول دیا تھا۔ اُس نے مذہب و اَخلاق کو سرمائے کا حامی اور محافظ بتا کر سرمایہ دارانہ ذہنیت کے ہاتھوں میں زر اندوزی کا خطرناک ہتھیار مہیا کر دیا تھا۔ یورپ میں اب تک دولت مندی مذہب و اخلاق کی رُو سے بُری سمجھی جاتی تھی، لیکن سرمایہ داری کے نئے تصور میں مذہب واَخلاق دولت مندی کے حامی اور خادم بن گئے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اٹھارہویں صدی عیسوی کے صنعت کار سرمایہ داروں نے انسانی ہمدردی اور غریب نوازی کے ہر جذبے سے عاری ہو کر زیادہ سے زیادہ سرمایہ جمع کرنا اور بڑھانا شروع کر دیا۔ مزدوروں اور محنت کاروں کو جانوروں سے بھی بدتر سمجھ کر کم سے کم اُجرتوں پر اُن سے زیادہ سے زیادہ محنت لی جانے لگی۔ اس صورتِ حال کے ردّ عمل نے اقتصادی مساوات کے نظریے کو ابھارنا شروع کر دیا۔

اٹھارہویں صدی کے وسط میں ہی رُوسو (Rousseau) اور بے باف نے انفرادی ملکیت کے نظام پر شدید نقطہ چینیاں کیں۔ سائمن شیلے وغیرہ نے ''غیر حکومتی اور نادولتی'' معاشروں کے قیام کی سکیمیں پیش کیں۔ جماعتی اشتراک کے منصوبوں کے مطابق فرانس، برطانیہ اور امریکا وغیرہ میں متعدد سوسائٹیاں ترتیب دی گئیں۔ چناں چہ فرانس میں ''پردوہون'' اور برطانیہ میں ''لوئس بلانک'' اور امریکا میں ''رابرٹ ادون'' اور متعدد دوسرے افراد نے معاشی مساوات کے انتظام پر مبنی بستیاں قائم کیں۔ چناں چہ 1836ء تک اس قسم کی متعدد سوسائٹیاں اور بستیاں یورپ اور امریکا میں قائم ہو گئیں اور انھیں ''سوشلسٹ کالونی''، یعنی اجتماعی آبادی کے نام سے پکارا جانے لگا۔ چناں چہ سوشلزم کے لفظ کا پہلا استعمال ان بستیوں پر ہی کیا گیا اور رفتہ رفتہ بعد میں یہ لفظ کیپٹل اِزم کا حریف اور مدمقابل بن گیا۔

اگرچہ معاشی مساوات پر مبنی یہ بستیاں اور سوسائٹیاں زیادہ دیر تک قائم نہیں رہ سکیں، لیکن سرمایہ داری کے خلاف یورپ میں جذبات عام ہوتے چلے گئے اور یہ ضرورت محسوس کی جانے لگی کہ جس طرح ایڈم سمتھ نے سرمایہ داری کے حق میں ایک مستقل فنی کتاب (The Wealth of Nations) لکھ کر اس اقتصادی نظام کو عملی نظریہ اور فنی ضابطوں کا حامل بنا دیا ہے، اسی طرح معاشی مساوات کے تصور کو بھی عملی اور فنی اعتبار سے مدلل اور قابل عمل بنا دیا جائے۔ جو چند افراد کے رضا کارانہ اشتراک تک محدود نہ رہے، بلکہ سرمایہ دارانہ نظام کی طرح ایک مستقل معاشی نظام کی صورت میں سامنے آجائے۔

اقتصادی مساوات کے لیے سوشلزم کا لفظ عرصے سے بولا جا رہا تھا اور اس کا اصطلاحی مفہوم متعین ہو چکا تھا کہ ایک ایسے معاشرے کی تشکیل، جس میں انسانوں کو اقتصادی طبقات میں تقسیم نہ کیا جائے، بلکہ جو وسائل معیشت میسر ہیں، انھیں یکساں طور پر سب کے مفاد کے لیے استعمال میں لایا جائے۔ چناں چہ اُنیس ویں صدی کے وسط میں سوشلزم کے رائج لفظ اور اس اصطلاح کو لے کر کارل مارکس (Karl Marx) نے سرمایہ دارانہ نظام کے مقابلے پر ایک نیا معاشی نظام ترتیب دیا اور ایڈم سمتھ کی کتاب کے

www.rahimia.org

جواب میں ''داس کیپٹل'' (Das Kapital) کے نام سے تین جلدوں پر مشتمل ایک مفصل و مدلل کتاب لکھی، جسے سوشلسٹ نظام کی بائبل کہا جانے لگا۔

مارکس نے اپنی اس تصنیف میں ''اجناس واشیا'' کے ذکر سے اپنی بحث کا آغاز کیا ہے۔ پھر پیداوارِ دولت، سکہ، سرمایہ، اشیا کی قدر ہائے تیاری، قدر ہائے استعمالی، فراہمی سرمایہ، گردشِ سرمایہ، سرمائے کے مختلف تغیرات و انتقالات، منافع کا معیار، منافع کی پیدائش، منافع کا پھیلاؤ، سودی اور اضافی منافع جات، صلاحیت کا نفع، محنت کا نفع، نفع کی تقسیم، آمدنیاں اور اُن کے ذرائع، زر کے اجارہ دارانہ انتقالات، اُجرتیں اور تجارت کے مختلف مراحل وغیرہ معاشیات و اقتصادیات کے سینکڑوں فنی اور ادق مسائل پر بحث کرکے سرمایہ دارانہ نظامِ معیشت کے تضادات واضح کیے اور ایڈم سمتھ کے اس دعوے کو کہ ''مذہب و اَخلاق' دولت و سرمایہ اور انفرادی ملکیت کے محافظ و خادم ہیں۔'' یہ کہہ کر ردّ کردیا کہ مذہب پر وقت کے معاشی اور اقتصادی حالات اثرانداز ہوکر انھیں مخصوص شکل میں ڈھال دیا کرتے ہیں اور سرمایہ دار طاقتیں مذہب و اخلاق کو اپنے مفادات کے تحفظ کے لیے استعمال کرنے لگتی ہیں۔ اور یہودیت و عیسائیت کے کلیسائی اور صلیبی مذہب کو اُس نے افیون کی حیثیت سے تعبیر کیا، جو عوام کو سیاسی، معاشی اور ذہنی آزادی کے حصول کی جدوجہد سے باز رکھنے کے لیے مسلسل غفلت میں مبتلا رکھتی چلی آ رہی تھیں۔ اور جس کے خلاف سولھویں صدی عیسوی سے یورپ میں احتجاج شروع ہو چکا تھا۔[(34)]

سوشلزم کے بنیادی اصول ونظریات

معاشی حوالے سے سوشلزم کے بنیادی اصول اور نظریات درج ذیل ہیں:

1۔ ''محنت'' ہی اصل عامل پیدائش دولت ہے

سوشلزم کے نزدیک سرمایہ داری کی لعنت اس وجہ سے ہے کہ اُس نظام میں ''سرمایہ'' اصل عامل پیدائش دولت ہے۔ چناں چہ سوشلزم نے اس لعنت سے نجات کے لیے ''سرمایہ'' کو الگ سے عامل پیدائش دولت ماننے سے انکار کردیا اور کارل مارکس نے اپنے فلسفے اور سائنس کی رُو سے یہ ثابت کیا کہ ''سرمایہ'' دراصل سوسائٹی کی اجتماعی محنتوں کے مجموعے کا حاصل ہے۔ لہٰذا اصل عامل صرف ''محنت'' ہے اور اس لیے بھی کہ کسی شئے میں ''افادیت'' اگر پیدا ہوتی ہے تو صرف ''محنت'' سے۔ اس کے علاوہ ''پیدائش دولت'' کا عمل وقوع پذیر نہیں ہوسکتا۔

کارل مارکس اس پر ایک مثال سے بھی استدلال کرتا ہے۔ فرض کیا کہ ایک آدمی کے پاس ''سرمایہ'' ہے۔ اس نے وہ تجوری میں بند کرکے رکھ دیا ہے یا فیکٹری ہے اور اُسے بند کیا ہوا ہے۔ اب اگر وہ سو سال بھی پڑی رہی، اُس میں کسی قسم کی ''قدرِ زائد'' نام کی کسی چیز کا اضافہ نہ ہوگا، جس قدرِ زائد کو کارخانے دار فیکٹری چلنے کی صورت میں ''سرمایہ'' کا حصہ تصور کرکے کھا جاتا ہے۔ اس طرح بدیہی طور پر یہ ثابت ہوگیا کہ اصل عامل ''محنت'' ہے، سرمایہ نہیں۔ یہ اصول سوشلزم کا بنیادی اصول ہے۔

اس حوالے سے سرمایہ داری اور سوشلزم کے نکتہ اختلاف کو سمجھنے کی ضرورت ہے۔ تبادلہ اشیا کی سادہ شکل یہ تھی کہ کسی جنس کو اپنی نجی ضرورت پوری کرنے کے لیے کسی دوسری جنس کے بدلے میں حاصل کیا جائے۔ دوسری شکل یہ ہے کہ نفع حاصل کرنے

www.rahimia.org

کے لیے کسی جنس کو جمع کیا جائے یا تیار کیا جائے۔ اُسے کسی شئے کے بدلے میں یا براہِ راست تبادلے کے بجائے زر یا سکہ وغیرہ کے ذریعے تبادلہ کیا جائے تو یہ دونوں شکلیں سرمایہ داری کا عنصر نہیں بنتیں۔ لیکن اگر ایک فریق زر کے بدلے میں اجناس اور اشیا اس لیے جمع یا تیار کرتا ہے کہ اس سے اپنی ضرورت پوری کرنے کے بجائے مزید زر' نفع کی شکل میں کمائے گا تو اس سے معیشت کا ایک نیا عمل وجود میں آتا ہے۔ جس میں طلب و رسد کی نسبت کا تعین اور حصولِ نفع کے لیے سکہ اور زر کی قیمت کا تعین کیا جاتا ہے۔ اس عمل معیشت سے اجناس اور اشیا پر جو ''زرِ منافع'' حاصل ہوگا، اس کی نوعیت کے تعین کا اختلاف ہی دراصل سرمایہ دارانہ نظام اور سوشلسٹ نظام کا نکتہ اختلاف ہے۔ سرمایہ داری نظام یہ کہتا ہے کہ یہ ''زرِ منافع'' اُس ''زر'' کا حاصل اور نتیجہ ہے، جس سے اشیا اور اجناس جمع کی گئی تھیں۔ جب کہ سوشلزم یہ کہتا ہے کہ یہ منافع اُس محنت کا حصہ ہے، جس نے وہ اجناس و اشیا پیدا کیں اور انھیں تیار کیا ہے۔ اس طرح سرمایہ داری میں ''سرمایہ'' کو اصل قرار دیا اور اُسے بنیادی عامل پیدائش دولت مانا، جب کہ سوشلزم نے ''محنت'' کو اصل ٹھہرایا اور اُسے عامل پیدائش دولت مانا۔ اب دولت کا مالک چوں کہ فرد ہوتا ہے، اس کی اساس پر وجود میں آنے والا معاشی نظام ''انفرادی ملکیت'' کے نظریے پر وجود میں آیا، جب کہ ''محنت'' کا تعلق مزدوروں کی اجتماعی طاقت اور ہر مرحلے میں اُن کے باہمی اشتراک و تعاون کے ساتھ ہے۔ اس لیے اس کی اساس پر قائم ہونے والا معاشی نظام' اجتماعی ملکیت کی بنیاد پر وجود میں آیا۔

2۔ انفرادی ملکیت کا خاتمہ اور اجتماعی ملکیت کا اثبات

سوشلزم کا دوسرا بنیادی اصول یہ ہے کہ ''اشیا'' کی ملکیت اجتماعی ہوگی۔ اس نظام میں انفرادی ملکیت کی نفی کی گئی ہے۔

لیکن یہاں ایک وضاحت ضروری ہے کہ عموماً ہمارے ہاں یہ تصور کیا جاتا ہے سوشلزم میں انفرادی ملکیت بالکلیہ مفقود ہے۔ یہ تصور صحیح نہیں ہے۔ بلکہ اس نظام میں بھی انفرادی ملکیت ہے، لیکن اس کا تعلق صرف روزمرہ کے استعمال میں آنے والی اشیا سے ہے۔ چناں چہ اشتراکیت میں ''صَرف'' میں آنے والی اشیا مثلاً گھر، موٹر، فرنیچر اور کپڑوں وغیرہ کی انفرادی ملکیت ہوتی ہے۔ بالفاظِ دیگر یوں کہا جاسکتا ہے کہ سوشلزم میں ''دولت'' کی انفرادی ملکیت ہوتی ہے، جب کہ ''سرمایہ'' یا ذرائع پیداوار کی ملکیت اجتماعی ہی ہوگی۔ چوں کہ اشتراکیت کے خیال میں سرمایہ دار کے ظلم کی ایک بڑی وجہ ''انفرادی ملکیت'' ہے اور یہی ساری خرابیوں کی جڑ ہے۔ چناں چہ ردِّعمل کے طور پر اشتراکیت نے انفرادی ملکیت کی بالکلیہ نفی کر کے اپنے نظام کی بنیاد ''اجتماعی ملکیت'' پر رکھ دی۔

یہی وجہ ہے کہ اشتراکی نظام میں جملہ ذرائع پیداوار مثلاً زمین، کارخانے اور مشینری وغیرہ افراد کی ملکیت سے خارج ہوتے ہیں اور تمام چیزوں کو اسٹیٹ کی ملکیت قرار دیا جاتا ہے۔ اسی طرح بیرونی اور داخلی تجارت، نیز بینک بھی افراد کے ہاتھوں سے نکل کر اسٹیٹ کے قبضے میں آجاتے ہیں۔ مختصر یہ کہ جملہ وسائل معاش اور پیدائش دولت کے سارے ذرائع اسٹیٹ کی ملکیت ہوتے ہیں۔ جو لوگ ان وسائل کو کام میں لاتے ہیں، کارخانوں کا انتظام اور نگرانی کرتے ہیں، زمینوں کو جوتتے اور کاشت کرتے ہیں یا تجارتی کاروبار انجام دیتے ہیں، ان سب کی حیثیت اسٹیٹ کے تنخواہ دار ملازمین اور محنت کشوں کی ہوتی ہے۔ جنھیں ان کی قابلیت، ضروریات اور کارگزاری کے لحاظ سے اسٹیٹ مشاہرہ دیتی ہے۔ اس نظام کے تحت افراد میں باہمی مسابقت کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا۔ کیوں کہ کوئی شخص اپنے مقرر مشاہرے سے زیادہ آمدنی یا نفع نہیں پیدا کرسکتا۔ البتہ اشتراکی نظام میں مسابقت کی

www.rahimia.org

اسپرٹ اس طرح قائم رہتی ہے کہ ایک ہی کارخانہ یا دفتر یا بینک کے ملازمین اپنی کارگزاری، لیاقت اور محنت سے ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کے لیے کوشاں رہتے ہیں۔ اور اس قسم کی مسابقت کو اشترا کی حکومت نہ صرف جائز قرار دیتی ہے، بلکہ ایجاباً اس کی حوصلہ افزائی بھی کرتی ہے۔ چناں چہ جن لوگوں کی قابلیت اور کارگزاری ان کے کام کے دوران میں ثابت ہوجاتی ہے، انھیں اسٹیٹ کی طرف سے بڑے صلے، انعامات اور اعزازات دیے جاتے ہیں۔ اور اس طرح انھیں ترغیب دلائی جاتی ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ محنت کر کے سوسائٹی اور حکومت کو فائدہ پہنچائیں۔ (35)

3۔ منصوبہ بند معیشت

منصوبہ بندی سوشلسٹ معیشت کا تیسرا بنیادی اصول ہے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ اس اصول کو دنیا میں متعارف کروایا ہی سوشلزم نے ہے۔ اور اپنی تمام تر تفصیلات کے ساتھ یہ اصول سوشلزم میں ہی چل سکتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ اس کی اہمیت کے پیشِ نظر اب بعض سرمایہ دار ممالک بھی اس کو اپناتے جا رہے ہیں۔

منصوبہ بندی کے اصول کے معنی یہ ہیں کہ مختلف اشیا اور مصنوعات کی پیداوار میں عام باشندوں کی ضروریات کا لحاظ کیا جاتا ہے۔ جس چیز کی جتنی ضرورت ہوتی ہے، وہ اسی مقدار میں تیار کی جاتی ہے۔ محنت اور دوسرے ذرائع کا باقی حصہ دیگر اشیا کی تیاری پر صَرف کردیا جاتا ہے۔ یہ کام ایک منصوبہ بندی کی مجلس (Planning Commission) سرانجام دیتی ہے، جو پہلے ملک کی عام ضروریات کا جائزہ لیتی ہے۔ پھر یہ فیصلہ کرتی ہے کہ موجود وسائل پیداوار، محنت اور سرمایہ کو کس طرح تقسیم اور منظّم کیا جائے کہ ملک میں موجود تمام لوگوں کی ضروریات کی خاطر خواہ تکمیل کی جاسکے۔ نیز اس مجلس کو یہ بھی تصفیہ کرنا پڑتا ہے کہ محنت، وسائل پیداوار کا کتنا حصہ اشیائے صَرف پر اور کتنا حصہ نئی مشینوں کی تیاری پر لگایا جائے۔ بالفاظِ دیگر اس مجلس کو ''اشیائے صرف'' اور ''آلاتِ پیدائش'' کے درمیان صحیح تناسب قائم کرنا پڑتا ہے۔ اس کے بعد منصوبہ بندی کرنے والی مجلس کو یہ طے کرنا پڑتا ہے کہ افراد ملک کو ان کی ضروریات کی تکمیل کے لیے ماہانہ تنخواہوں اور دوسری شکلوں میں اجتماعی آمدنی کا کتنا حصہ تقسیم کیا جائے، تاکہ ''اشیائے صرف'' کی معین مقدار، مقررہ قیمتوں پر ساری کی ساری فروخت ہوجائے۔ مزید برآں منصوبہ بندی کرنے والوں کو اس امر کا بھی انتظام کرنا پڑتا ہے کہ یہ آمدنی جو ماہانہ تنخواہوں اور دیگر طریقوں سے ان کے ہاتھ میں آنے والی ہے، اس کو وہ اشیائے صَرف کی خریداری کے کام میں لائیں اور اسے نہ تو بے کار جمع رکھیں اور نہ غیر ضروری کاموں پر صرف کریں۔ اس کے علاوہ مجلس منصوبہ بندی اس امر کی نگرانی کرتی ہے کہ آلاتِ پیدائش یعنی نئی مشینوں کی تیاری کے لیے جو سرمایہ اور محنت مختص کیا جائے، اس کا استعمال صحیح طور سے ہو۔ یعنی اس کی ذخیرہ اندوزی نہ ہونے پائے۔

منصوبہ بندی کا ایک تقاضا یہ بھی ہے کہ وسائل پیدائش میں اضافے کے ساتھ افراد میں تنخواہ کا اضافہ اور دیگر شکلوں میں مزید آمدنیاں تقسیم کی جائیں۔ تاکہ ان کی قوتِ خرید میں اسی تناسب سے اضافہ ہو، جس نسبت سے پیداوار میں اضافہ ہو رہا ہے۔ ورنہ زائد پیداوار ''قوتِ خرید'' کی کمی کی وجہ سے بے کار ہوجائے گی۔ کیوں کہ اس کا کوئی خریدار نہ ہوگا۔

ان تمام باتوں سے ظاہر ہے کہ منصوبہ بندی کا کام مؤثر طریقے سے صرف ایک اشترا کی اسٹیٹ ہی میں ممکن ہے، جہاں معاشی زندگی کے ہر شعبے پر اسٹیٹ کا مکمل قبضہ ہو اور اس کو قیمتوں کے تعین، قوتِ خریداری میں کمی بیشی اور ''اجتماعی آمدنی'' کی

www.rahimia.org

تقسیم کا کامل اختیار ہو۔

مولانا حفظ الرحمٰن سیوہارویؒ سوشلزم کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ:

''اسلام جس مکمل قانون کا نام ہے، اس کے ساتھ اشتراکیت کا رابطہ اور اتحاد ناممکن ہے، ...لیکن جب ہم نظام کے فقط اقتصادی پہلو سے بات کرتے ہیں۔ اور دنیا کے دیگر غیر اسلامی نظام ہائے معاشی کے مقابلے میں اس کو پیش نظر لاتے ہیں تو اس وقت ہم کو اس حقیقتِ ثابتہ کے اظہار میں کوئی باک نہ ہونا چاہیے کہ اس میں شک نہیں کہ اقتصادی نظام کے بہت سے امور میں اسلام اور اشتراکیت باہم متقارب نظر آتے ہیں اور سرمایہ دارانہ نظام کے خلاف دونوں ہم آہنگ ہیں۔ اگر چہ طریقۂ کار کے اختلاف سے دونوں کی راہیں اس وادی میں قطعاً جدا جدا ہیں۔''[36]

اسلام کا اقتصادی نظام سرمایہ داری اور سوشلزم سے ہٹ کر ایک کامل اور جامع نظامِ معیشت ہے۔ اس کے بنیادی اساسی اصول قرآن حکیم، احادیثِ نبویہ، فقہی کتابوں کی روشنی میں حضرت الامام شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے بیان کیے ہیں۔ اس کا ایک جامع خاکہ ایک الگ مضمون کا تقاضا کرتا ہے، جو ''امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ کا نظریۂ معیشت'' کے عنوان سے شاملِ اشاعت ہے۔

حوالہ جات

1۔ القرآن 10:7۔

2۔ نیز مفسرین نے لکھا ہے کہ: معایش "مَعِیْشَۃٌ" کی جمع ہے اور یہ عاش یعیش عیشًا و معیشۃً کا مصدر ہے اور معیشت اصل میں مَعْیِشَۃٌ بروزنِ مَفْعِلَۃٌ ہے۔ یاء پر زیر پڑھنا مشکل تھا، اس لیے اُسے عین کی طرف منتقل کر دیا مَعِیْشَۃٌ ہوگیا۔ لیکن جب معیشۃ کی جمع معایش آئی تو یاء کا کسرہ واپس اصل جگہ پر آ گیا۔ (تفسیر ابن عطیہ اُندلسی "المحرّر الوجیز فی تفسیر کتاب اللّٰہ العزیز" ۔ص:686 وتفسیر ابن کثیر۔ص:786۔طبع: دارالکتب العلمیہ، بیروت)

3۔ القرآن 29:2۔ 4۔ القرآن 10:62۔

5۔ عن عائشۃ. شعب الإیمان للبیھقی. حدیث نمبر: 1233. دار الکتب العلمیہ. بیروت.

6۔ دیکھئے المنجد۔ مادہ ''عاش''، ''قصد''۔

7۔ کتابِ معاشیات۔ از قیصر منظور علی شیخ۔ ج:1۔ص:7۔طبع: کراچی۔

8۔ اقتصادیات کے ابتدائی اصول۔ مصنفہ محمد حسین۔ص:1۔مطبوعہ: حیدرآباد۔ مئی 1958ء۔

9. مقدمہ ابن خلدون. الباب الخامس فی المعاش. الفصل الثانی فی وجوہ المعاش. ص: 408.

10۔ البدور البازغہ۔ از امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ۔ص:55۔

11۔ تفصیل کے لیے دیکھئے! دولتِ اقوام (The Wealth of Nation)۔ از ایڈم سمتھ۔

12۔ اقتصادیات کے ابتدائی اصول۔ مصنفہ محمد حسین۔ص:25۔مطبوعہ: حیدرآباد۔ مئی 1958ء۔

13۔ ایضاً۔ 14۔ ایضاً۔

15۔ اقتصادیات کے ابتدائی اصول۔ص:24۔

16۔ معاشیات نویں دسویں۔ص:12۔

www.rahimia.org

17۔ معاشیات نویں دسویں۔ ص:6۔ مطبوعہ: سندھ ٹیکسٹ بک بورڈ، حیدر آباد، سندھ۔

18۔ ایضاً۔ ص:8۔

19۔ القرآن 11:6۔ نیز آیت هُوَالَّذِیْ خَلَقَ لَکُمْ مَّا فِی الْاَرْضِ (29:2)۔ اور اس کی تفسیر جو شیخ الہندؒ نے فرمائی ہے۔ ملاحظہ ہو ''**ایضاح الأدلّه**''، ص:68، طبع: دیوبند۔

20۔ معاشیات نویں دسویں، ایضاً، ص:13۔ 21۔ ایضاً۔ ص:15۔

22۔ جہاں تک گزشتہ ادوار میں ''لگان'' کی صورت میں زمین کے معاوضے کے وصول کرنے کا معاملہ ہے، اس کی حقیقت صرف یہ ہے کہ جب انسانی زندگی اپنے ارتقا کے تیسرے مرحلے ''ارتفاقِ ثالث'' میں داخل ہوئی تو قدرتی وسائل (زمین) کی حفاظت، اس کی تعمیر و ترقی اور قوم کے افراد میں اس کی تقسیم کا اختیار قومی حکومتوں کے پاس آ گیا۔ چناں چہ حکومتیں اپنی حفاظتی محنت (افادۂ حفاظت) کے سبب سے ان کی مالک قرار پائیں۔ چناں چہ انھوں نے ''زمین'' کو کاشت کاری یا دیگر مقاصد کے لیے انسانوں کو مفت یا معاوضہ لے کر عطا کرنے کا اختیار استعمال کیا۔ اگرچہ ان زمینوں پر افراد کی اجتماعیت کام کرتی تھی، لیکن حکومتیں اپنی مملکت میں واقع زمین اور قدرتی وسائل کی سیکیورٹی اور تحفظ کی ذمہ دار تھیں۔ اس حوالے سے ''زمین'' قدرتی حالت میں نہیں رہی، بلکہ سرمایہ دارانہ اصطلاح کے مطابق بھی ''سرمایہ'' قرار پاتی ہے۔ اس لیے زمین کو الگ سے عامل پیدائش دولت قرار دینا درست نہیں، بلکہ معاشیات کی جدید اصطلاح کے مطابق یہ 'سرمایہ'' ہے یا ''منجمد محنت'' ہے۔

23۔ داس کیپٹل، کارل مارکس، ج:2، ص:31، مطبوعہ: انجمن ترقی اردو، کراچی، پاکستان۔

24۔ ابتدائی معاشیات، سین اینڈ داس، ص:330، طبع: کراچی۔

25۔ معاشیات، ص:71-70، سندھ ٹیکسٹ بک بورڈ۔

26۔ اسلام اور جدید معیشت و تجارت، از مولانا تقی عثمانی، ص:38، طبع: ادارۃ المعارف، کراچی۔ اس کتاب کے پہلے ایڈیشن میں یہ بات موجود تھی۔ موجودہ ایڈیشن میں کچھ تبدیلی کی گئی ہے۔

27۔ خطبات و مقالات، از مولانا عبیداللہ سندھیؒ، ص:486، طبع: مکی دارالکتب، لاہور۔

28. **حُجّة اللّٰه البالغه**، از امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ، **باب اقامة الارتفاقات و إصلاح الرّسوم، المبحث السّادس**، ج:1، ص:221، طبع: قاهره.

29۔ تفصیلات کے لیے دیکھیے ''اسلام کا زرعی نظام''، از مولانا محمد تقی امینی، ص:102 تا 108، طبع: مکتبہ امدادیہ، ملتان۔

30۔ نظامِ معیشت اور اسلام، از ڈاکٹر احمد حسین کمال، ص:53-52، طبع: طیب پبلشرز، لاہور۔

31۔ ابتدائی معاشیات، سین اینڈ داس، ص:330، طبع: کراچی۔

32۔ اسلام کا معاشی نظریہ، ص:19۔

33۔ اسلام کا اقتصادی نظام، از مولانا حفظ الرحمٰن سیوہارویؒ، ص:78-677، طبع: ادارۃ الانور، کراچی۔

34۔ نظامِ معیشت اور اسلام، ڈاکٹر احمد حسین کمال، ص:61 تا 63۔

35۔ اسلام کا معاشی نظریہ، ایضاً، ص:24۔

36۔ اسلام کا اقتصادی نظام، ص:684۔

☆

www.rahimia.org

معاشیات

قرآنی اُصولِ معاشیات

تحریر: حضرت مولانا حفظ الرحمٰن سیوہارویؒ
ترتیب وتحقیق: مفتی عبدالخالق آزاد رائے پوری

(دورِ حاضر میں دنیا جس معاشی بحران میں مبتلا ہے، اس سے کسی باشعور شخص کو انکار نہیں ہوسکتا۔ اگرچہ متمدن اقوام نے اپنی سوچ کی بنیاد پر مختلف معاشی نظام نہ صرف وضع کیے، بلکہ ان کو عمل کے میدان میں سے بھی گزارا، لیکن ابھی تک ان میں سے کوئی ایسا نظام سامنے نہیں آسکا، جسے انسانیت کی مکمل فلاح و بہبود کا ضامن قرار دیا جاسکے۔ سرمایہ داری رُو بہ زوال ہے۔ وہ اپنے بنیادی اصولوں میں ترمیم و تنسیخ اور دیگر ذرائع سے اپنے آپ کو بچانے کی آخری جدوجہد میں ہے۔ اسی طرح اشتراکی نظام بھی ہلچل سے دوچار ہے۔ اس کے اساسی نظریات کی عمارتیں زمین بوس ہورہی ہیں۔ ان کی جگہ نئے نظریات کی آبیاری ہورہی ہے۔

ایسے میں قرآن حکیم جیسی لازوال کتاب شعوری نظروں کی مرکزِ توجہ ہے کہ جس کے الفاظ تک چودہ صدیوں میں اپنی تابانی اور شوکت نہ کھو سکے تو اس کے معانی و مفاہیم اور مقاصد کس قدر اپنے اندر استقلال رکھتے ہوں گے۔ لباس کے مقابلے میں وجود اور جسم کے مقابلے میں روح کی پائیدار حیثیت مُسلَّم ہے۔ اسی کتابِ مبین نے دیگر شعبہ ہائے حیات کی طرح معاشیات میں لازوال اصول متعین کیے ہیں، جن پر حدیث وفقہ کی روشنی میں ایک انقلابی اور عوامی فلاح و بہبود پر مبنی پائیدار نظام قائم کیا جاسکتا ہے۔

قرآن حکیم کے ان اصولوں کی انقلابی توضیح وتشریح جمعیت علمائے ہند کے ناظمِ اعلیٰ حضرت مولانا محمد حفظ الرحمٰن سیوہارویؒ (تلمیذِ رشید حضرت مولانا محمد انور شاہ کشمیریؒ و خلیفہ مجاز حضرت اقدس مولانا شاہ عبدالقادر رائے پوریؒ و فیض یافتہ حضرت مولانا عبیداللہ سندھیؒ) نے معاشیات پر اپنی کتاب ''اسلام کا اقتصادی نظام'' میں کی ہے۔

درجِ ذیل مقالہ مولانا سیوہارویؒ کی اسی کتاب سے ماخوذ ہے۔ اس کے حوالہ جات کی جدید تخریج وعناوین کے ساتھ معاشیات سے متعلق اس شمارے میں شائع کیا جارہا ہے، تاکہ نوجوان نسل نہ صرف دینی شعور سے بہرہ ور ہو، بلکہ علمائے حق کے گراں قدر انقلابی خیالات سے بھی مستفید ہو۔ اس مقالے کے مطالعے سے علمِ معاشیات کے بنیادی قرآنی اصول سمجھنے میں بڑی مدد ملے گی۔ ان اصولوں کی روشنی میں اسلام کے اقتصادی اور معاشی نظام کا ایک مکمل خاکہ سامنے آجاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اسے سمجھنے اور اس کے مطابق اپنا ملکی نظام قائم کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین! مدیر)

www.rahimia.org

صالح معاشی نظام کی ضرورت اور اہمیت

کائناتِ ہست و بود میں ''ایک صالح معاشی نظام'' کی اس لیے ضرورت پیش آتی ہے کہ ہر ایک انسان میں یہ فطری جذبہ موجود ہے کہ اس کو خدائے تعالیٰ کی بخشی ہوئی زندگی سے فائدہ اُٹھانا چاہیے، مگر یہ انفرادی جذبہ جب زندگی کی کش مکش اور وسائلِ حیات کی کشاکش میں ایک دوسرے سے ٹکراتا ہے تو قانونِ فطرت جو کہ خداتعالیٰ کی جانب سے تمام کائنات پر حاوی ہے، ہر ایک انسان کو اجتماعی زندگی بسر کرنے پر مجبور کرتا ہے۔ لیکن یہ حیاتِ اجتماعی بغیر کسی ایسے نظام کے متصور نہیں ہوسکتی جب تک ان کے درمیان ایسا تعاون واشتراک موجود نہ ہو، جس کی بنیاد عدل اور حقِ معیشت کی مساوات پر قائم ہو، تا کہ وہ ''صالح معاشی نظام'' کے لیے کلید بن سکے۔ اور اس قسم کا تعاون واشتراک جب ہی عالمِ وجود میں آسکتا ہے کہ نظامِ معاشیات میں حسبِ ذیل اصول کارفرما ہوں:

1۔ وہ نظام ہر متعلقہ فرد کی معاشی زندگی کا کفیل ہو اور اپنے دائرہ عمل میں کسی بھی فرد کو معاشی زندگی سے محروم نہ رکھتا ہو۔

2۔ ایسے اسباب وسائل کا قلع قمع کرتا ہو جو معاشی دست بُرد کا موقع مہیا کر کے افرادِ انسانی کے درمیان ظلم واستبداد کی راہیں کھولتے اور معاشی نظام کے فساد کا موجب بنتے ہوں۔

3۔ دولت اور اسبابِ دولت کو کسی خاص فرد یا محدود جماعت کے اندر سمٹ آنے اور اس فرد یا جماعت کو نظامِ معیشت پر قابض ومسلط ہونے سے باز رکھتا ہو، تا کہ معاشی نظام تمام کائناتِ انسانی کی فلاح کے بجائے مخصوص طبقوں کے اَغراض کا آلۂ کار بن کر نہ رہ جائے۔

4۔ محنت اور سرمایہ کے درمیان صحیح توازن قائم کرتا اور ایک دوسرے کی حدود پر غاصبانہ دست بُرد سے بچاتا ہو۔

اسلام کے معاشی نظام کے فوائد وثمرات

تجربہ اس بات کا شاہد ہے کہ ''جدید علمی دور'' میں من جملہ دیگر علوم وفنون کے ''علم المعیشت'' کو بھی بڑی حد تک ایک علم وفن کی حیثیت حاصل ہے اور بڑے بڑے علمائے یورپ وایشیا نے اس پر ضخیم تصانیف پیش کی ہیں، لیکن اس تمام ایں وآں اور چنیں و چناں کے باوجود ''علم المعیشت'' کا اصل مقصد — یعنی عام رفاہیت وخوش حالی — آج تک عنقا بنی ہوئی ہے۔ اور دولت وذرائع دولت سب سمٹ کر ایک مخصوص طبقے کے ہاتھ میں اس طرح آگئے ہیں کہ عام انسانی آبادی کے لیے زندگی ''موت'' سے زیادہ بھیانک بن گئی ہے۔ بہ خلاف اُس دور — دورِ نبوتؐ و دورِ خلافتِ راشدہ — کے، وہاں معیشت کی یہ علمی اور فنی موشگافیاں اگرچہ عنقا تھیں، مگر عام خوش حالی اور رفاہیت کا یہ عالم تھا کہ بلالحاظ مسلم وکافر، مومن ومشرک، مرد وعورت، صغیر وکبیر اور اَجیر و مستاجر سب ہی امن واطمینان کی زندگی بسر کرتے تھے اور معیشت میں فارغ البال تھے۔ تاریخ اس بات کا مواد فراہم کرتی ہے کہ:

> ''اس دور میں ایک وقت مملکتِ اسلامیہ کے اندر ایسا آیا کہ لوگ صدقات کے مال کو لیے پھرتے تھے، مگر اس کا قبول کرنے والا ہاتھ نہ آتا تھا۔''(1)

معاشی نظام کا اصل منشا اور مقصد

علاوہ ازیں یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ دنیا میں کوئی کام بغیر کسی منشا اور محرک کے وجود پذیر نہیں ہوتا اور ہر عمل کی پشت پر

www.rahimia.org

ایک خاص ذہنیت کارفرما ہوتی ہے۔ پس کسی ''معاشی نظام'' کے صالح اور فاسد ہونے کا معیار بھی اس کے محرکات اور اس کے منشا کے صالح اور فاسد ہونے پر موقوف ہے۔ سو اگر اس کی پشت پر فاسد ذہنیت کام کر رہی ہے اور اس کے محرکات سرتاسر فاسد ہیں تو بلاشبہ وہ نظام ''فاسد نظام'' ہے۔ اور اگر اس کی پشت پناہی ایک صالح ذہنیت کر رہی ہے اور اس کے تمام تر محرکات صالح اور اس کا منشا خیر ہے تو اس نظام کے صالح ہونے میں پھر کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں ہے۔

اس اصول کے پیشِ نظر جب ہم ''معاشی نظام'' پر گہری نظر ڈالتے اور فکرِ عمیق سے کام لے کر جانچتے ہیں تو اس کے محرکات و منشا یا اس سے متعلق ذہنیت کو صرف دو صورتوں میں محدود پاتے ہیں:

1۔ ایک یہ کہ ''معاشی نظام'' کو اس لیے قائم کیا جائے کہ اس کے ذریعے سے زیادہ سے زیادہ نفع کمایا جائے اور اس کو لین دین اور سودے کی اسپرٹ میں رکھا جائے، تاکہ ''هَلْ مِنْ مَّزِيْدٍ ۝۳۰''[2] (مزید چاہیے) کا نعرۂ نفع بازی اور فائدہ طلبی کسی حد پر بھی جا کر ختم نہ ہو سکے۔ یہ نظریہ ''سرمایہ دارانہ نظام'' کا بانی اور مؤسس ہے اور اسی کے زیرِ اثر یہ نظام پھلتا پھولتا ہے۔ ''فوڈ کمپنی'' کا مالک کروڑ پتی اور ارب پتی ہونے کے باوجود بھی مارکیٹ میں (ذاتی) ترقی اور اضافے ہی کا خواہش مند رہتا ہے۔ کیوں کہ وہ معاشی نظام کے جس ماحول میں جدوجہد کر رہا ہے، اس کی بنیاد زیادہ سے زیادہ نفع کمانے اور سودے بازی پر قائم ہے۔ اور یہ صرف اربابِ دولت و ثروت ہی کو اَور زیادہ بلند کرتا ہے اور باقی تمام انسانی آبادی کو افلاس و احتیاج سے دوچار بناتا ہے۔ یہاں رفعِ حاجات و تکمیلِ ضروریات کے محرکات کام نہیں کرتے، جو عام رفاہیت کا پیغام لائیں اور عام خوش حالی کو بحال کریں۔

2۔ دوسرے یہ کہ معاشی نظام کا محرک اور منشا نفع بازی نہ ہو، بلکہ ضروریاتِ زندگی کی تکمیل اور رفعِ حاجات ہو۔ اور اس کے منصۂ شہود پر لانے کے لیے صرف یہ ذہنیت کام کر رہی ہو کہ انفرادی و اجتماعی احتیاجات کو پورا کیا جائے، نہ کہ زیادہ سے زیادہ نفع کو پیشِ نظر رکھا جائے۔

معاشی نظام کے ان ہر دو محرکات یا ہر دو ذہنیتوں میں سے اسلام ایک ایسے معاشی نظام کا بانی اور مؤسس ہے کہ جس کی بنیاد صرف کائناتِ انسانی کی رفعِ حاجات و ضروریات اور انفرادی و اجتماعی احتیاجات کی تکمیل پر قائم ہے۔ وہ معاشیات کو دولت مندوں کے درمیان نفع کی دوڑ کا میدان نہیں بنانا چاہتا، بلکہ رفعِ حاجات و تکمیلِ ضروریات کے لیے ایک مفید اور نفع بخش ذریعہ بنا کر اس کی افادیت کو عام کرنا چاہتا ہے۔ گویا اس نظامِ معیشت میں:

> ''بلاشبہ زیادہ سے زیادہ کمانے والے افراد موجود ہوں گے، کیوں کہ سعی وکسب کے بغیر کوئی مؤمن زندہ رہ ہی نہیں سکتا، لیکن جو فرد جتنا زیادہ کمائے گا اتنا ہی زیادہ انفاق پر مجبور بھی ہوگا۔ اور اس لیے افراد کی کمائی جتنی بڑھتی جائے گی، اتنی ہی زیادہ جماعت بہ حیثیت جماعت کے خوش حال ہوتی جائے گی۔ قابل اور مستعد افراد زیادہ سے زیادہ کمائیں گے۔ یہ صورت پیدا نہ ہو سکے گی کہ ایک طبقے کی کمائی دوسرے طبقوں کے لیے محتاجی و مفلسی کا پیغام ہو جائے، جیسا کہ اب عام طور پر ہو رہا ہے۔''[3]

اس تمام تر تفصیل کے بعد اب غور کیجیے کہ جس معاشی نظام کے کُل پُرزے اس طرح ڈھالے گئے ہوں، اس کا نشوونما اور

www.rahimia.org

اس کی ترقی ایسے ترتیبی اجزا پر قائم ہو، جو صرف طبیعات ہی تک آکر نہ ٹھہر جائیں، اَخلاقی اور مذہبی محاسن کو بھی اپنی آغوش میں لیں، بلکہ مذہب اور دستورِ الٰہی کے زیرِ فرمان عالمِ وجود میں آئیں اور اس کے محرک فلاحِ دارین اور سعادتِ کائنات کے وہ اصول ہوں، جن میں معاشیات رفعِ حاجات اور تکمیلِ ضروریات کے لیے ہو، نہ کہ زیادہ سے زیادہ سودا بازی اور نفع طلبی کے لیے تو ایسے صالح اور صحیح نظامِ معاشی کا وجود بلاشبہ دنیا کے لیے پیامِ رحمت اور دعوتِ امن و سلامتی ہے۔

الحاصل! ''اسلامی معاشی نظام'' ایسا بہتر نظام ہے، جو اپنے اندر علم المعیشت کے قدیم و جدید نظام ہائے مذہبی و عقلی کے تمام محاسن سموئے ہوئے ہے اور اس سے بھی زیادہ خوبیوں کا مالک ہے۔ اور ان کے معائب و نقائص سے یکسر خالی، بلکہ ان کے مسموم اثرات کا بے نظیر تریاق ہے اور ان تمام محاسن کے علاوہ اس کو یہ برتری حاصل ہے کہ وہ انسانوں کے دماغ کی اختراع نہیں ہے کہ جس کی بنیاد انتقام یا طبقاتی منافرت جیسی خام کاریوں پر رکھی گئی ہو، بلکہ وہ نظامِ کائنات کے خالق کا بتایا ہوا نظام ہے۔

قرآن حکیم کے بیان کردہ اصولِ معاشیات

یہ بات بھی فراموش نہیں کرنی چاہیے کہ قرآن عزیز نے اپنی اَساسی روِش کے مطابق عبادات، معاشرتی معاملات، سیاسیات اور دیگر شعبہ ہائے زندگی کی طرح معاشیات میں بھی صرف اساسی اصول اور معجزانہ اختصار کے ساتھ اصول و کلیات کا ہی ذکر کیا ہے۔ اور ان کی تفصیلات و تشریحات کو ارشاداتِ نبویؐ (احادیث) اور ان سے مستنبط احکامِ (فقہ) کے حوالے کر دیا ہے۔ معاشیات سے متعلق قرآنِ عزیز نے جن اساسی اصولوں کا ذکر کیا ہے، وہ یہ ہیں:

پہلا اصول: حقِ معیشت میں مساوات

رزق اور معاش کا حقیقی تعلق صرف ذاتِ الٰہی سے وابستہ ہے اور وہی ہر فرد کا کفیل ہے۔ اور اگرچہ اس کی مصلحتِ عام اور حکمتِ تام کا تقاضا یہ ہے کہ دنیا کے اس متنوع ماحول میں رزق کے اندر تفاوتِ درجات پایا جائے، لیکن امارت و غربت کے فطری تنوع کے باوجود یہاں ایک فرد بھی محروم المعیشت نہ رہنے پائے۔ کیوں کہ اس نے حقِ معیشت کو سب کے لیے مساوی اور برابر رکھا ہے اور کسی کو بھی اس حقِ مساوات میں دخل انداز ہونے کا حق عطا نہیں فرمایا۔

قرآن حکیم کے دلائل سے اس اصول کا ثبوت

اللہ تعالیٰ ہر فرد کی معاشی زندگی کا کفیل ہے اور اس کا وعدہ ہے کہ زمین پر چلنے والے ہر ایک جان دار کی معیشت اس کے ذمے ہے۔ اس کے لیے حسبِ ذیل نصوصِ (قرآنیہ) قابلِ مطالعہ ہیں:

(1) وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْاَرْضِ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا [4]

(اور زمین پر چلنے والے ہر جان دار کے رزق کی ذمہ داری اللہ تعالیٰ نے اپنے ذمہ لے لی ہے۔)

(2) وَفِي السَّمَآءِ رِزْقُكُمْ وَمَا تُوْعَدُوْنَ ﴿۲۲﴾ [5]

(اور تمھارا رزق اور جس شئے کا تم وعدہ دیے گئے ہو، آسمان میں (یعنی اللہ تعالیٰ کے ذمہ میں) ہے۔''

(3) وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَكُمْ خَشْيَةَ اِمْلَاقٍ ۭ نَحْنُ نَرْزُقُهُمْ وَاِيَّاكُمْ ۭ [6]

www.rahimia.org

(اور افلاس کے ڈر سے اپنی اولاد کو نہ مار ڈالا کرو، ہم ہی تمھیں بھی روزی دیتے ہیں اور انھیں بھی۔)

(4) وَ مَنْ یَّرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ وَ الْاَرْضِ ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ [7]

(اور آسمان اور زمین سے تم کو کون روزی پہنچاتا ہے۔ کیا اللہ تعالیٰ کے ساتھ کوئی اَور معبود ہے؟)

(5) اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الرَّزَّاقُ ذُو الْقُوَّةِ الْمَتِیْنُ ﴿۵۸﴾ [8]

(بے شک اللہ تعالیٰ ہی روزی دینے والا ہے، بڑی مضبوط طاقت والا ہے۔)

(6) وَ جَعَلْنَا لَكُمْ فِیْهَا مَعَایِشَ وَ مَنْ لَّسْتُمْ لَهٗ بِرٰزِقِیْنَ ﴿۲۰﴾ [9]

(اور ہم نے تمھارے لیے زمین میں معیشت کے سامان بنا دیے اور ان کے لیے جن کو تم روزی نہیں دیتے۔)

(7) هُوَ الَّذِیْ خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا [10]

(وہ (خدا) وہ ذاتِ پاک ہے، جس نے تمھارے لیے وہ سب کچھ پیدا کیا، جو زمین میں ہے۔)

ان آیات میں بغیر کسی تخصیص کے ہر فردِ بشر کو خطاب ہے اور ان کی روح یہ ہے کہ معیشت و اسبابِ معیشت خدائے تعالیٰ کے خزانۂ عامرہ کی ایسی عطا و بخشش ہے کہ جس سے فائدہ اٹھانے کا ہر جان دار کو برابر کا حق ہے۔

ان (مذکورہ بالا) آیات میں (بیان کردہ) اس روح کی زیادہ وضاحت وصراحت حسبِ ذیل آیات کرتی ہیں:

(8) وَ جَعَلَ فِیْهَا رَوَاسِیَ مِنْ فَوْقِهَا وَ بٰرَكَ فِیْهَا وَ قَدَّرَ فِیْهَاۤ اَقْوَاتَهَا فِیْۤ اَرْبَعَةِ اَیَّامٍ سَوَآءً لِّلسَّآىٕلِیْنَ ﴿۱۰﴾ [11]

(اور رکھے اس زمین میں بوجھل پہاڑ (اس کی پیٹھ پر) اور برکت رکھی اس کے اندر اور چار دن میں اندازہ سے رکھیں اس میں ان کی خوراکیں جو برابر ہیں حاجت مندوں کے لیے۔)

(9) وَ اللّٰهُ فَضَّلَ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ فِی الرِّزْقِ فَمَا الَّذِیْنَ فُضِّلُوْا بِرَآدِّیْ رِزْقِهِمْ عَلٰى مَا مَلَكَتْ اَیْمَانُهُمْ فَهُمْ فِیْهِ سَوَآءٌ اَفَبِنِعْمَةِ اللّٰهِ یَجْحَدُوْنَ ﴿۷۱﴾ [12]

(اور اللہ تعالیٰ نے تم میں سے بعض کو بعض پر رزق میں برتری دی ہے، پھر ایسا نہیں ہوتا کہ جن کو زیادہ روزی دی گئی ہے، وہ اپنی روزی کو زیر دستوں پر لوٹا دیں، حال آں کہ اس روزی میں وہ سب کے سب برابر کے حق دار ہیں۔ پھر کیا یہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کے صریح منکر نہیں ہو رہے ہیں۔)

اس آیت کا ایک ترجمہ اور مطلب وہ ہے، جو اوپر بیان کیا گیا۔ اس آیت کے ایک معنی ''روحُ المعانی'' میں یہ بھی کیے ہیں:

''و جوّز أن یکون معنی الأیة: ''إنّ اللّٰہ تعالیٰ فضّل بعضاً علٰی بعضٍ فی الرّزق.'' و أنّ المفضّلین لا یردّون من رزقھم علٰی مَن دونھم شیئاً، و إنّما أنا رازقھم، فالمالک و المملوک فی أصل الرّزق سواء، و إن تفاوتا کمًّا و کیفاً.... واختار فی ''الکشّاف'' أنّ المعنٰی أنّه سبحانهٗ جعلکم متفاوتین فی الرّزق فرزقکم أفضل من ما رزق ممالیککم، و ھم بشر مثلکم و إخوانکم، و کان ینبغی أن تردّوا فضل ما رزقتموہٗ علیھم، حتّٰی تساووا فی الملبس و المطعم، کما یحکٰی عن ابی ذرّ رضی اللّٰہ عنهٗ.'' [13]

www.rahimia.org

(اور جائز ہے کہ آیت کا معنی یہ ہو کہ اللہ تعالیٰ نے رزق میں بعض کو بعض پر فضیلت دی ہے اور جن کو فضیلت حاصل ہے، وہ اپنے رزق میں سے اپنے سے کم تر افراد کو کچھ نہیں واپس کرتے اور میں یقیناً ان کا روزی رساں ہوں۔ چناں چہ مالک اور مملوک بنیادی رزق میں مساوی ہیں، گو مقدار اور معیار میں تفاوت ہو۔ اور ''کشاف'' میں اس مفہوم کو اختیار کیا ہے کہ آیت کا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تم کو رزق کے حوالے سے ایک دوسرے سے متفاوت بنایا ہے۔ چناں چہ تمھارا رزق، تمھارے ماتحتوں کو دیے گئے رزق سے افضل ہے، حال آں کہ وہ تم جیسے انسان اور تمھارے بھائی ہیں۔ اور یہ مناسب تھا کہ تم اپنے حاصل شدہ رزق کا زائد حصہ ان پر لوٹا دیتے، تا کہ وہ لباس اور خوراک میں مساوی ہوجاتے، جیسا کہ حضرت ابوذر غفاریؓ سے منقول ہے۔)

اسی طرح اس آیت کی ایک تفسیر ''بحر المحیط'' وغیرہ میں یہ بھی کی گئی ہے:

''و قرأ ابوبكر عن عاصم و ابوعبدالرحمٰن و الأعرج أفبنعمة اللّٰه تجحدون''. و يكون المعنى علٰى قرأة الخطاب أنّ المالكين ليسوا برادّى رزقهم علٰى مماليكهم، بل أنا الّذى أرزقهم و إيّاهم، فلا يظنّوا أنّهم يعطونهم شيئاً، و إنّما هو رزقى أجريه علٰى أيديهم، و هم جميعاً فى ذٰلك سواء، لا مزيّة لهم علٰى مماليكهم، فيكون المعطوف عليه المقدّر، يناسب هٰذا المعنى، يقال لا يفهمون ذٰلك فيجحدون نعمة اللّٰه. [14]

(ابوبکر نے روایت کیا ہے کہ عاصم، ابوعبدالرحمٰن اور اعرج کی قرأت یہ ہے: ''کیا تم اللہ کی نعمت کا انکار کرتے ہو؟'' خطاب کی قرأت کے مطابق معنی یہ ہے کہ مالکان اپنا رزق اپنے مملوک اور ماتحتوں کو نہیں لوٹاتے، بلکہ اِن کو اور اُن کو بھی میں رزق دیتا ہوں۔ تو وہ یہ گمان نہ کریں کہ وہ اِن کو کچھ دیتے ہیں۔ بلاشبہ وہ میرا رزق ہے، جس کو میں ان (مالکان) کے ہاتھوں پر جاری کرتا ہوں۔ وہ سب اس میں مساوی ہیں۔ ان کو اپنے مملوکوں پر کوئی امتیاز حاصل نہیں۔ ایسی صورت میں ''معطوف علیہ'' مقدر ہے جو اس معنی سے مناسبت رکھتا ہے۔ یوں کہا جا سکتا ہے کہ ''وہ اس بات کو نہیں سمجھتے۔ پس وہ اللہ کی نعمت کا انکار کرتے ہیں۔)

ان آیات میں حقِ معیشت کی مساوات کا جس قدر صاف اور صریح اعلان ہے، وہ آپ اپنی مثال ہے۔ اور اس کا انکار بداہت وصراحت کا انکار ہے:

اے کریمے کہ از خزانۂ غیب — گبر و ترسا وظیفہ خور داری
دوستاں را کجا کنی محروم — تو کہ با دشمناں نظر داری

(اے معزز ذات! کہ اپنے غیب کے خزانے سے تمام امیر وغریب کو خود وظیفہ دیتا ہے۔
دوستوں کو آپ کیسے محروم کریں گے، جب کہ آپ دشمنوں پر بھی نظرِ کرم رکھتے ہیں۔)

لیکن اب سوال یہ ہے کہ منشائے الٰہی کے اس مقصدِ عظیم کو پورا کون کرے؟ اور اس عالمِ اسباب میں اس کی تکمیل کس کے ذمے واجب ہے؟ تو اسلام کے نظام کا مکمل نقشہ جن نگاہوں کے سامنے ہے، وہ بہ آسانی یہ جواب دے سکتے ہیں کہ اس ''عالمِ

www.rahimia.org

تشریع'' میں یہ فریضہ نائبِ الٰہی ''خلیفہ'' پر عائد ہوتا ہے کہ قلم رو اسلامی میں ایک فرد بھی ایسا نہیں ہونا چاہیے، جو حقِ معیشت سے محروم ہو۔ اور نہ کسی کو یہ حق حاصل ہو کہ وہ حقِ معیشت میں دراندازبن سکے اور جو حکومت اس منشائے الٰہی کو پورا نہ کرتی ہو وہ ''فاسد نظام'' کی حامل اور نظامِ عدل سے منحرف ہے۔

چناں چہ سورت البقرہ کی اس آیت هُوَ الَّذِيْ خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا ۚ [15] کی تفسیر کرتے ہوئے شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحبؒ ارشاد فرماتے ہیں:

''جملہ اشیائے عالم بہ دلیل (اس) فرمان واجب الاذعان تمام بنی آدم کی مِلک معلوم ہوتی ہیں، یعنی غرضِ خداوندی تمام اشیا کی پیدائش سے **دفعِ حوائجِ جملۂ ناس** (تمام انسانوں کی حاجات کو پورا کرنا) ہے۔ اور کوئی شئے **فی حدّ ذاته** (ذاتی طور پر) کسی کی مملوکِ خاص (ذاتی ملکیت میں) نہیں، بلکہ ہر شئے اصل خلقت میں جملۂ ناس (تمام انسانوں) میں مشترک ہے۔ اور مِن وَجه (ایک طرح سے) سب کی مملوک ہے۔

ہاں! بوجہِ رفعِ نزاع (جھگڑا ختم کرنے) وحصولِ انتفاع (نفع اٹھانے کے لیے) قبضہ کو علتِ مِلک (ملکیت کا سبب) مقرر کیا گیا۔ جب تک کسی شئے پر ایک شخص کا **قبضۂ تامّۂ مستقلّه** (مستقل اور پورا قبضہ) باقی ہے، اس وقت تک کوئی اَور اس میں دست درازی نہیں کر سکتا۔

ہاں! خود مالک و قابض کو چاہیے کہ اپنی حاجت سے زائد پر قبضہ نہ رکھے، بلکہ اس کو اَوروں (دوسروں) کے حوالے کردے۔ کیوں کہ بہ اعتبارِ اصل اَوروں (دوسروں) کے حقوق اس کے ساتھ متعلق ہو رہے ہیں۔

یہی وَجہ ہے کہ مالِ کثیر حاجت سے بالکل زائد جمع رکھنا بہتر نہ ہوا، گو زکوٰۃ بھی ادا کر دی جائے۔ انبیًا و صلحا اس سے بہ غایت مجتنب (انتہائی پرہیز کرتے) رہے۔ چناں چہ احادیث سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے، بلکہ بعض صحابہؓ و تابعینؒ وغیرہ نے حاجت سے زائد رکھنے کو حرام ہی فرما دیا۔ بہر کیف غیر مناسب وخلافِ اولیٰ ہونے میں تو کسی کو کلام ہی نہیں۔

اس کی وَجہ یہی ہے کہ **زائد علی الحاجة** (ضرورت سے زائد مال) سے اس کی تو کوئی غرض متعلق نہیں۔ اور اَوروں (دوسروں) کی مِلک **مِن وجه** (ایک پہلو سے) اس میں موجود۔ تو گویا شخص مذکور **مِن وجه** مالِ غیر (دوسرے کے مال) میں قابض ومتصرف ہے۔

اس کا حال بعینہٖ مالِ غنیمت کا سا تصور کرنا چاہیے۔ وہاں بھی قبل تقسیم یہی قصہ ہے کہ مالِ غنیمت تمام مجاہدین کا مملوک سمجھا جاتا ہے، مگر بہ وَجہِ ضرورت وحصولِ انتفاع بہ قدرِ حاجت ہر کوئی مالِ مذکور سے منتفع (فائدہ اٹھا) سکتا ہے۔ ہاں! حاجت سے زائد جو رکھنا چاہے اس کا حال آپ کو معلوم ہے کہ کیا ہونا چاہیے (یعنی خائن شمار ہوگا)۔'' [16]

احادیثِ نبویہؐ سے اس اصول کا ثبوت

مشہور محدث ابنِ حزم ظاہریؒ نے اس سلسلے میں ''محلّٰی'' میں جو روایات نقل کی ہیں، وہ بھی اسی کی تائید کرتی ہیں:

(1) ''**عن ابی سعید الخدریؓ أنّ رسول الله ﷺ قال: ''من کان معه فضل ظهر فلیعد به علٰی من لا ظهر له، و من کان له فضل من زاد فلیعد به علٰی من لا زاد له.''**

www.rahimia.org

قال: فذكر من أصناف المال ما ذكر، حتّٰى رأينا أنّه لا حقّ لأحد منّا فی فضل." [17]

(حضرت ابوسعید خدریؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہؐ نے ارشاد فرمایا: ''جس شخص کے پاس قوت و طاقت کے سامان اپنی حاجت سے زائد ہوں، اس کو چاہیے کہ فاضل سامان کو کمزور کو دے دے۔ اور جس شخص کے پاس سامانِ خورد و نوش حاجت سے زائد ہو، اس کو چاہیے کہ فاضل سامان نادار اور حاجت مند کو دے دے۔''

حضرت ابوسعید خدریؓ فرماتے ہیں کہ: نبی اکرمؐ اسی طرح مختلف انواعِ مال کا ذکر فرماتے رہے، حتیٰ کہ ہم نے یہ گمان کر لیا کہ ہم میں سے کسی شخص کو اپنے فاضل مال پر کسی قسم کا کوئی حق نہیں ہے۔)

اور ابوسعید خدریؓ کی روایت پر بحث کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''**و هٰذا إجماع الصّحابةؓ يخبر بذٰلک ابو سعيدؓ، و بكلّ ما فی هٰذا الخبر نقول.**'' [18] (اس پر صحابہؓ کا اجماع ہے۔ حضرت ابوسعید خدریؓ اس اجماع کی خبر دے رہے ہیں اور جو کچھ اس حدیث میں ہے، ہم بھی یہی کہتے ہیں۔)

اس بات پر صحابہؓ کا اجماع ہے کہ اگر کوئی شخص بھوکا ننگا، یا ضروریاتِ رہائش سے محروم ہے تو مال دار کے فاضل مال سے اس کی کفالت کرنا فرض ہے۔ تمام ائمہ مجتہدین کا بھی یہی مسلک ہے۔

(2) ''**قال عمرؓ بن الخطاب: "لو استقبلت من أمری ما استدبرت لأخذت فضول أموال الأغنياء، فقسّمتها علٰى فقراء المهاجرين.**'' [19]

(حضرت عمر بن خطابؓ نے فرمایا: ''جس بات کا مجھے آج اندازہ ہوا ہے، اگر اس کا پہلے سے اندازہ ہو جاتا تو میں اس میں کبھی تاخیر نہ کرتا اور بلا شبہ اربابِ ثروت کی فاضل دولت لے کر فقرا اور مہاجرین میں بانٹ دیتا۔'')

ابنِ حزمؒ اس روایت کی سند پر حکم لگاتے ہوئے فرماتے ہیں:

''**و هٰذا أسناد فی غاية الصّحة و الجلال.**'' (یہ سند نہایت صحیح اور پُر از جلالت ہے۔)

(3) ''**وصح عن ابی عُبيدة بن الجراحؓ و ثلاث مائة من الصّحابة رضی اللّٰه عنهم أنّ زادهم فنی، فأمرهم ابو عبيدة، فجمعوا أزوادهم فی مزودين، وجعل يقوتهم إيّاها علٰى السّواء.**'' [20]

(حضرت ابوعبیدہؓ اور تین سو صحابہ رضی اللہ عنہم سے یہ روایت صحت کو پہنچی ہے کہ ان کے کھانے پینے کا سامان ختم ہو رہا تھا۔ حضرت ابوعبیدہؓ نے حکم دیا کہ جس جس کے پاس جس قدر موجود ہے، اس کو حاضر کرے۔ پھر سب نے اپنے اپنے سامان کو دو توشہ دانوں میں جمع کیا اور حضرت ابوعبیدہؓ اس سب کو سب میں برابر تقسیم کرتے تھے۔''

(4) **عن محمّد بن علی بن ابی طالب أنّه سمع علیؓ بن ابی طالب يقول: "إنّ اللّٰه تعالٰى فرض علٰى الأغنياء فی أموالهم بقدر ما يكفی فقراء هم، فإن جاعوا أوعروا و جهدوا فبمنع الأغنياء و حقّ علٰى اللّٰه تعالٰى أن يحاسبهم يوم القيامة و يعذبهم عليه.**'' [21]

(محمد بن علی سے روایت ہے کہ انھوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہٗ کو فرماتے ہوئے سنا کہ: ''اللہ تعالیٰ نے مال داروں کے اموال پر ان کے فقرا کی حاجت کو بہ قدرِ کفایت پورا کرنا فرض قرار دیا ہے۔ پس اگر وہ بھوکے ننگے یا معاشی تکلیف میں مبتلا

www.rahimia.org

ہوں گے، اس لیے کہ مال دار اپنا حق ادا نہیں کرتے تو اللہ تعالیٰ کو اس بات کا حق ہے کہ ان سے قیامت کے دن حساب لے اور اس پر انھیں عذاب دے۔)

اسی قسم کی دوسری احادیث اور آیاتِ قرآنی کو دلیل میں پیش کرتے ہوئے مشہور محدث ابنِ حزم ظاہریؒ (اپنی کتاب ''المحلّٰی'' میں) یہ مسئلہ (نمبر 725) تحریر فرماتے ہیں:

''و فرض علٰی الأغنیاء من أهل کلّ بلد أن یقوموا بفقراء هم و یدبرهم السّلطان علٰی ذٰلک، إن لّم تقم الزّکوات بهم، و لا فی سائر أموال المسلمین بهم، فیقام لهم بما یأکلون من القُوت الّذی لا بُدّ منهٔ، و من اللّباس للشّتاء و الصّیف بمثل ذٰلک، و بمسکن یکنّهم من المطر، و الصّیف، و الشّمس، و عیون المارّة.'' [22] (اور ہر ایک ایسی بستی کے اربابِ دولت کا فرض ہے کہ وہ فقرا اور غربا کی معاشی زندگی کے کفیل ہوں اور اگر مالِ فئے (بیت المال کی آمدنی) ان غربا کی معاشی کفالت کو پوری نہ ہوتی ہو تو سلطان (امیر) ان اربابِ دولت کو اس کفالت کے لیے مجبور کرسکتا ہے (یعنی ان کے فاضل مال سے بہ جبر لے کر فقرا کی ضروریات میں صرف کرسکتا ہے)۔ اور ان کی زندگی کے اسباب کے لیے کم ازکم یہ انتظام ضروری ہے کہ ان کی ضروری حاجت کے مطابق روٹی مہیا ہو۔ پہننے کے لیے گرمی اور سردی دونوں موسموں کے لحاظ سے لباس فراہم ہو۔ اور رہنے کے لیے ایک ایسا مکان ہو، جو ان کو بارش، گرمی، دھوپ اور سیلاب جیسے امور سے محفوظ رکھ سکے۔)

اب ان تمام نصوصِ قرآنی اور ان کی مؤید احادیث و فقہی روایات کو سامنے رکھ کر بہ نظرِ انصاف غور فرمایئے کہ ''اسلام کا معاشی نظام'' حقِ معیشت کی مساوات کا کس طرح صاف اور واضح اعلان کرتا ہے۔ اور امیر اسلام کے اختیارات میں وسعت دے کر اس کی حفاظت کے لیے کس قدر عادلانہ دستور قائم کرتا ہے۔

غربت و امارت سے متعلق ایک شبہ کا جواب

جو دماغ اسلامی نظام کے حقائق سے ناآشنا اور موجودہ فاسد نظام ہی کو — جس میں امارت و غربت کا قابلِ نفرت حد تک تفاوت نظر آتا ہے — اسلامی نظام سمجھتے ہیں، ان کے لیے یہ باتیں بلاشبہ حیرت زا ہیں۔ ان میں سے بعض تو اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ یہ جو کچھ کہا جا رہا ہے، منشائے الٰہی کے خلاف ہے۔ کیوں کہ خدا تعالیٰ نے جب خود ہی لاکھوں کروڑوں انسانوں کو محروم المعیشت پیدا کیا ہے اور غربت و امارت کا یہ فرق بھی کہ — ایک کروڑ پتی ہے اور دوسرا نانِ جویں سے بھی محروم — اسی کا بنایا ہوا ہے، تو پھر یہ کیسے باور کیا جاسکتا ہے کہ خدا تعالیٰ کی مرضی یہ ہے کہ حقِ معیشت میں تمام افرادِ انسانی مساوی ہیں اور یہ کہ کوئی فرد اس کائنات میں محروم المعیشت نہ رہے؟

بعض اس گمراہی میں ہیں کہ یہ جو کچھ کہا گیا ہے، اسلامی نظام کو ہمہ گیر ثابت کرنے کے لیے ایک جدید کوشش ہے، جو دنیا کے رُجحانات اور وقت کے تقاضوں کے سامنے سپر ڈالتے ہوئے احکامِ الٰہی کی ترمیم و تبدیل کی شکل میں پیش کی جارہی ہے، یا اشتراکیت و اشتمالیت سے مرعوب ہو کر (اسلام کو) قبائے مارکسزم کے جسم پر موزوں کیا جا رہا ہے، لیکن افسوس اور صد افسوس کے ساتھ یہ کہنا پڑتا ہے کہ یہ دونوں خیالات، وساوس اور اوہامِ فاسدہ سے زیادہ وقعت نہیں رکھتے۔ درحقیقت یہ نتیجہ ہے اس عام بے خبری

www.rahimia.org

کا، جو اسلامی تعلیم کے متعلق مسلم فضا میں ابرِ محیط کی طرح چھائی ہوئی ہے۔ یہ ثمرہ ہے اپنے حقائق سے یکسر نا آشنا رہتے ہوئے اس مرعوبیت کا، جو مغربی تعلیم کی بہ دولت ہم پر طاری و ساری ہے۔

عالمِ تکوین اور عالمِ تشریع کا فرق

یہ دونوں خیالات' وسوسہ یا سفسطہ کیوں ہیں؟ اس لیے کہ ہم اس قسم کے مسائل پر بحث کرتے وقت اسلام کی اس بنیادی حقیقت کو فراموش کر دیتے ہیں کہ ''عالمِ تکوین'' اور ''عالمِ تشریع'' میں کیا فرق ہے؟ اور یہ کہ اللہ تعالیٰ نے جس قانونِ الٰہی کو کائنات کی کامرانی کا واحد حل تجویز فرمایا ہے، ذی عقل کائناتِ عالم کو جس کے امتثال (پورا کرنے) کی تکلیف دی ہے، اور جس کی تعمیل (عمل کرنے) کے لیے مکلّف بنایا ہے، اس کا تعلق تکوینیات سے ہے، یا تشریعیات سے؟ سو اگر ہم اس بنیادی حقیقت کو اچھی طرح سمجھ لیتے تو بلا شبہ اس قسم کے وساوس اور اوہام کی صورت ہی پیدا نہ ہوتی۔

اللہ تعالیٰ کا تکوینی نظام

یہ ایک حقیقت ہے کہ خالقِ کائنات نے کائنات کے آغاز و انجام کا جو تکوینی نظام بنایا ہے، اس کا تمام تر تعلق صرف اپنی ذاتِ احدیت ہی کے ساتھ رکھا ہے۔ اس میں کسی دوسرے کے دخل کی مطلقاً گنجائش نہیں ہے اور نہ ہم کو یہ معلوم ہے کہ نظامِ تکوینی میں کسی شئے کے لیے کیا ہے اور کیا نہیں اور نہ اس علم کا ہم کو مکلّف بنایا گیا ہے۔ اس کا تعلق سرتاسر ''عالمِ تکوین'' سے متعلق ہے۔

انسانیت کے لیے تشریعی نظام

البتہ اس نے حضرتِ انسان (ثقلین یعنی جن و اِنس) کو جب کہ عقل و شعور اور ادراک و تمیز عطا فرمائے ہیں تو اس عطا و بخشش کے بعد اس کو یوں ہی بے کار اور معطل نہیں چھوڑ دیا، بلکہ اشیا کے حسن و قبح اور اپنی مرضیات و نامرضیات کی معرفت اور ہدایت و گمراہی اور حق و باطل میں امتیاز کے لیے، نیز افراد کو اجتماعی سِلک میں منسلک کرنے کے لیے ایک بہترین ''نظام'' عطا فرمایا اور اس میں اچھی اور بُری دونوں راہوں کو واضح کر دیا۔ (ارشادِ خداوندی ہے:)

''وَهَدَيْنٰهُ النَّجْدَيْنِ ﴿۱۰﴾'' [23] (اور ہم نے اُسے دونوں راہوں کی رہنمائی کر دی۔)

اس نظام کا نام نظامِ تشریعی ہے اور کائنات میں ''پہلے انسان'' کے ساتھ ساتھ یہ ''نظام'' عالمِ تشریع پر حاوی ہے اور انبیا و رُسل کے ذریعے برابر دنیائے انسانی پر کارفرما رہا ہے اور اس کی فلاح و بہبود کا ضامن و کفیل ہے۔ پس یہی وہ نظام ہے کہ جب حدِ کمال کو پہنچا تو ''قرآن عزیز'' کی شکل میں جلوہ افروز ہوا۔

پس اگر یہ بنیادی حقیقت ہمارے پیشِ نظر رہے تو ہم بہ آسانی یہ سمجھ سکتے ہیں کہ ہمارے دائرے سے یہ باہر ہے کہ ہم ''نظامِ تکوینی'' سے بحث کریں، بلکہ ہم صرف ''نظامِ تشریعی'' (قانونِ تشریع) ہی کے دائرے میں محدود رہ کر بحث کر سکتے ہیں۔

اب قرآنِ عزیز سے نقل شدہ نصوص کو ملاحظہ فرمائیے اور غور کیجیے کہ کیا ان نصوص کی مراد یہ ہے کہ چوں کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی مصلحتِ عامہ اور حکمتِ بالغہ کی بنا پر کائناتِ انسانی میں امارت و غربت کے تفاوتِ درجات کو خلق کیا ہے، اس لیے مردِ مؤمن کے لیے ضروری ہے کہ وہ اس تفاوتِ درجات کو ترقی دینے کے لیے ایسا نظام قائم کرے کہ تمام ثروت و دولت امیروں کے ہاتھ میں

www.rahimia.org

آجائے اور کروڑوں انسان فقیر اور محتاج بن کر اور ایڑیاں رگڑ رگڑ کر جانِ آفریں کو جان سپرد کردیں اور اس طرح ''العیاذ باللہ'' منشائے الٰہی کو پورا کریں۔

اگر ان آیاتِ قرآن کا مطلب یہ نہیں ہے تو پھر اس کے سوائے دوسرا کیا مطلب ہوسکتا ہے کہ درجاتِ معیشت میں فطری حد تک تفاوت کے باوجود حقِ معیشت میں تمام کائناتِ انسانی مساوی اور برابر کی شریک ہے اور کسی صاحبِ ثروت کی دولت وثروت غریبوں کی غربت میں اضافہ کرنے کے لیے نہیں ہے، بلکہ خداتعالیٰ کی وہ امانت ہے جو اجتماعی نظام کے زیرِ فرمان غربا و مساکین کی غربت و مسکنت کو فنا کرنے کے لیے استعمال ہونی چاہیے۔ گویا صاحبِ ثروت کی ثروت، غربا کی غربت کے لیے رحمت ثابت ہو، نہ کہ زحمت۔

اور اگر اربابِ ثروت ایسے عادل سسٹم کو منظور نہ کریں اور اس پر عمل پیرا نہ ہوں تو پھر خدا کے نائب (خلیفہ) کا فرض ہے کہ وہ اسلام کے ''اجتماعی معاشی نظام'' کے مطابق اربابِ ثروت کو قانوناً اس پر مجبور کرے۔ اور اگر بیت المال کا مالیہ (اس کے لیے) کافی نہ ہو اور اس سے بھی قلم روِ خلافت میں محروم المعیشت (معاشی ضروریات سے محروم) انسان موجود رہ جائیں تو اہلِ دولت کے سرمائے سے بہ جبر حاصل کرکے ''حقِ معیشت کی مساوات'' کو بروئے کار لائے، خواہ وہ اہلِ دولت اپنے مال میں سے تمام ''عائد شدہ مالی فرائض وحقوق'' ادا کرچکے ہوں۔

الحاصل! قرآنی نصوص اور ان کی مؤید احادیث رسول ﷺ اور ان سے مستنبط فقہی احکام یہ واضح کرتے ہیں کہ ''حقِ معیشت کی مساوات'' کا یہ نظریہ منشائے الٰہی کے خلاف نہیں، بلکہ عین منشائے الٰہی کے مطابق ہے اور یہ جدید نظریہ نہیں ہے کہ مارکسزم کی حمایت یا اس سے مرعوبیت کی بنا پر احکامِ اسلامی کی انوکھی تعبیر کے ذریعے وجود میں آیا ہو، بلکہ اسلام کا وہ بنیادی اور اساسی حکم ہے، جو اپنے وجود سے آج تک غیر متبدل اور غیر متزلزل رہا ہے۔ اور اگر ہم نے اس کو سمجھنے کی کبھی کوئی کوشش نہیں کی، یا دوسرے انسانوں کے اختراعی معاشی نظاموں سے مرعوب ہوکر ہم نے ''اسلامی معاشی نظام'' کو یکسر بھلا دیا تو اس میں اپنا قصور ہے، نہ کہ اسلامی نظام کے بیان کرنے والے اور اس کی اصل حقیقت سے روشناس کرانے والے کا۔

یہ بھی سخت گمراہی ہے کہ ہم یہ یقین کر بیٹھے ہیں کہ غربت و امارت کا یہ غیر فطری تفاوت اور ظالمانہ امتیاز جو آج ہم کو کائنات پر چھایا ہوا نظر آتا ہے، خدا کا بنایا ہوا ہے، بلکہ یہ ''فاسد نظام ہائے معاشی'' کے ثمرات ونتائج ہیں اور خدا کی مرضی یہ ہے کہ اس قسم کے تمام نظام ہائے فاسد کو یک قلم سوخت ہوجانا چاہیے۔

(اضافہ از مرتب): حقِ معیشت میں مساوات کا اصول اور خلفائے راشدینؓ

حقِ معیشت میں مساوات کا اصول خلفائے راشدینؓ کے طرزِ فکر وعمل سے بھی واضح ہوتا ہے۔ چناں چہ حضرت ابوبکر صدیقؓ کے بارے میں احادیث میں آتا ہے کہ انھوں نے اپنے عہدِ خلافت میں بیت المال سے مال کی تقسیم کے وقت تمام لوگوں کو برابر اور مساوی طور پر اموال دیے۔ ان اموال کی تقسیم کے اعداد وشمار یہ ہیں کہ ایک بار 7.1/3 درہم اور دوسری بار 20 درہم سب کو ملے۔ چناں چہ ''کتاب الخراج'' میں قاضی ابویوسفؒ نے حضرت ابوبکر صدیقؓ کے دورِ خلافت کے بارے میں لکھا ہے:

www.rahimia.org

''و بقيت بقيّة من المال، فقسّمها بين النّاس بالسّوية علٰى الصّغير و الكبير، و الحُرّ و المملوک، و الذّکر و الأنثٰى، فخرج علٰى سبعة دراهم و ثلث لکلّ إنسان. فلمّا کان العام المقبل، جاء مال کثير هو أکثر من ذٰلک، فقسّمهٗ بين النّاس، فأصاب کُلّ إنسان عشرين درهماً.'' [24] (حضرت ابوبکر صدیقؓ نے بیت المال کے بقیہ مال کو لوگوں کے درمیان مساوی طور پر تقسیم کر دیا۔ ہر ایک چھوٹے اور بڑے، آزاد اور غلام، عورت اور مرد کو سات درہم اور ایک درہم کا تہائی حصہ مساوی طور پر ہر انسان کو دیا۔ جب دوسرا سال آیا اور پہلے سے زیادہ مال بیت المال میں آیا تو حضرت ابوبکر صدیقؓ نے اُسے بھی لوگوں کے درمیان اسی اصول پر تقسیم کیا۔ چناں چہ ہر انسان کو بیس درہم مساوی طور پر ملے۔)

اس پر کچھ لوگ حضرت ابوبکر صدیقؓ کے پاس آئے اور انھوں نے کہا کہ:

''يا خليفة رسول اللّٰه! إنّک قسّمت هٰذا المال فسوّيت بين النّاس، و من النّاس اُناس لهم فضل و سوابق و قدم، فلو فضّلت أهل السّوابق و القدم و الفضل بفضلهم.'' [25]

(اے رسول اللہؐ کے خلیفہ! آپ نے یہ مال لوگوں کے درمیان مساوی طور پر تقسیم کیا ہے، حال آں کہ کچھ لوگ ایسے ہیں، جن کی قدیم خدمات ہیں، دینی کاموں میں سبقت لے جانے والے ہیں اور فضیلت رکھنے والے ہیں۔ کاش کہ آپ ان لوگوں کو کچھ زیادہ عنایت فرماتے۔)

چناں چہ صحابہؓ میں سے ایسے صحابی بھی ہیں، جنھوں نے بدر میں خدمات سرانجام دیں۔ بدر سے لے کر اب تک اُن کی محنتیں ہیں اور کچھ وہ لوگ ہیں، جو فتح مکہ کے موقع پر مسلمان ہوئے۔ کچھ لوگ ہیں، جو ابھی مسلمان ہوئے۔ آپ نے سب کو برابر کر دیا۔ قاضی ابو یوسف نے حضرت ابوبکر صدیقؓ کا یہ جواب نقل کیا ہے۔ انھوں نے ارشاد فرمایا:

''أمّا ذکرتم من السّوابق و القدم و الفضل، فما أعرفني بذٰلک، و إنّما ذٰلک شيء ثوابهٗ علٰى اللّٰه جلّ ثنائهٗ، و هٰذا معاش فالاُسوة فيه خير من الاُثرة.'' [26]

(یہ جو تم نے سبقت لے جانے والے قدیم اور صاحبِ مرتبہ لوگوں کا ذکر کیا ہے، یہ ایسا ہے کہ میں تم سے زیادہ جانتا ہوں۔ یہ ایک ایسا کام ہے، جس کا ثواب اللہ جل شانہٗ پر ہے۔ یہ معاشیات کا معاملہ ہے۔ اس میں ایک کو دوسرے پر ترجیح دینے سے مساوات بہتر ہے۔)

صاحبِ فضل و احسان کے کاموں کا اس دنیا میں اس کا کوئی معاوضہ نہیں ہے کہ غزوۂ بدر میں زیادہ خدمات سرانجام دیں۔ گویا مطالبہ کرنے والوں نے یہ مطالبہ نہیں کیا تھا کہ مال داروں کو مزید ملنا چاہیے اور غریبوں کو کم ملنا چاہیے۔ بلکہ اُن کا مطالبہ یہ تھا کہ جنھوں نے غلبہ دین کے لیے خدمات زیادہ انجام دی ہیں، اُن کی حوصلہ افزائی کے لیے اُن کو کچھ زیادہ ملنا چاہیے۔ تو حضرت ابوبکر صدیقؓ نے کہا کہ یہ معاشیات کا معاملہ ہے، اس میں معاشی مساوات کے قانون پر عمل ہوگا۔

حضرت عمر فاروقؓ کا دور آیا تو انھوں نے اسلام کے لیے زیادہ خدمات سرانجام دینے والوں کو ترجیح دی اور انھیں بیت المال سے زیادہ مال عطا کیا، لیکن آخری زمانے میں انھوں نے بھی معاشی مساوات کے قانون پر عمل کرنے کا عزم اور ارادہ ظاہر کیا۔

www.rahimia.org

چناں چہ قاضی ابو یوسفؒ لکھتے ہیں:

''و لمّا رأى المال قد كثر، قال: ''لئن عشت إلى هٰذه اللّيلة من قابل، لألحقن أخرى النّاس بأولٰهم حتّى يكونوا في العطاء سواء.'' (27) (جب حضرت عمرؓ نے مال کی کثرت کو دیکھا تو ارشاد فرمایا کہ: ''اگر میں آئندہ سال آج کے دن تک زندہ رہا تو میں ضرور پیچھے رہ جانے والے لوگوں کو پہلوں کے ساتھ شامل کر دوں گا، یہاں تک کہ تمام لوگ بیت المال کی عطا حاصل کرنے میں مساوی ہو جائیں۔)

گزشتہ تمام قرآنی آیات اور احادیث سے حقِ معیشت میں مساوات کا قانون واضح ہوتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ کسی مملکت کے قدرتی اور جمع شدہ ملکی قومی وسائل اور اموال پر اُس سوسائٹی میں بسنے والے تمام انسانوں کا مساوی حق ہے۔ گویا ''پیدائشِ دولت'' میں حصہ لینے کے لیے ملکی قومی دولت کو استعمال کرنے کا تمام لوگوں کو حق ہے۔ کسی خاص طبقے کی اجارہ داری نہیں ہے۔ پھر اپنی اپنی صلاحیت اور استعداد کے مطابق ان قومی اور قدرتی وسائل میں محنت و مشقت کر کے اشیا میں افادیت پیدا کریں گے۔ انسانی محنتوں اور صلاحیتوں کے تفاوت سے فطری طور پر درجاتِ معیشت میں فرق ہو سکتا ہے۔ درجاتِ معیشت میں فطری تفاوت ہونے کی صورت میں بھی زیادہ کمانے والے لوگوں پر بالکل نہ کما سکنے والوں اور محتاجوں کا حق بھی ہے۔ زکوٰۃ اور دوسرے فرائضِ مالیہ ادا کرنے کے باوجود بھی عام انسانوں کی ضروریات نہ پوری ہو رہی ہوں تو حکومت کا فرض ہے کہ زیادہ کمانے والوں سے مال لے کر لوگوں کی ضروریات کو پورا کرنے کا اہتمام کرے۔ (مرتب)

دوسرا اصول: درجاتِ معیشت میں فطری تفاوت

اگرچہ حقِ معیشت میں سب مساوی ہیں، لیکن درجاتِ معیشت میں مساوی نہیں ہیں۔ معیشت میں درجات کا تفاوت ایک حد تک فطری ہے، یعنی یہ ضروری نہیں کہ سب کے لیے سامانِ معیشت ایک ہی طرح کا ہو، لیکن یہ ضروری ہے کہ ہو سب کے لیے۔ مگر درجات کا یہ تفاوت ایسے اعتدال پر قائم رہے کہ کسی حالت میں بھی وہ لوگوں کے درمیان وجہِ ظلم نہ بن سکے۔ یعنی تفاوتِ درجات (فرق) تو ہو، لیکن نہ ایسا کہ ''معیشت'' انسانوں کو دو طبقوں میں اس طرح تقسیم کر دے کہ ایک کی ترقی دوسرے کے فقر و افلاس کا سبب بنے اور دوسرا پہلے کے معاشی اغراض کا آلہ کار بن کر رہ جائے۔

قرآن عزیز نے اس تفاوتِ درجات کو اس طرح بیان کیا ہے:

(1) نَحْنُ قَسَمْنَا بَيْنَهُمْ مَّعِيْشَتَهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَ رَفَعْنَا بَعْضَهُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجٰتٍ (28)

(دُنیوی زندگی میں ہم نے لوگوں کی معیشت ان کے درمیان تقسیم کر دی ہے اور اس کو اس طرح کر دیا کہ بعض کو دوسرے بعض پر معیشت میں بلندی حاصل ہے۔)

(2) اَللّٰهُ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ وَ يَقْدِرُ ؕ (29)

(اللہ جس کے لیے چاہتا ہے، رزق میں فراخی دیتا ہے اور جس کے لیے چاہتا ہے تنگی ڈالتا ہے۔)

(3) وَ هُوَ الَّذِيْ جَعَلَكُمْ خَلٰٓئِفَ الْاَرْضِ وَ رَفَعَ بَعْضَكُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجٰتٍ لِّيَبْلُوَكُمْ فِيْ مَآ اٰتٰكُمْ ؕ (30)

('اور وہی ہے جس نے تمھیں زمین میں ایک دوسرے کا جانشین بنایا اور بعض کو بعض پر مرتبے دیے، تا کہ جو کچھ تمھیں دیا

www.rahimia.org

ہے، اس میں تمھیں آزمائے۔)

(4) وَاللّٰهُ فَضَّلَ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ فِي الرِّزْقِ ۚ فَمَا الَّذِيْنَ فُضِّلُوْا بِرَآدِّيْ رِزْقِهِمْ عَلٰى مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ فَهُمْ فِيْهِ سَوَآءٌ ۭ اَفَبِنِعْمَةِ اللّٰهِ يَجْحَدُوْنَ (31) (خدائے تعالیٰ نے تم میں سے بعض کو بعض پر رزق میں برتری دی۔ پھر ایسا نہیں ہوتا کہ جس کسی کو زیادہ روزی دی ہے، وہ اپنی روزی سے اپنے زیرِدستوں کو لوٹا دے۔ حال آں کہ اس روزی میں سب برابر کے حق دار ہیں۔ پھر کیا یہ لوگ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کے صریح منکر نہیں ہو رہے؟)

گویا رزق میں تفاوتِ درجات کی مصلحت ایک خاص قسم کی آزمائش پر مبنی ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ ایک جانب غنی کو صاحبِ ثروت بنا کر اس سے یہ مطالبہ کرتا ہے کہ وہ اپنی ثروت کو تنہا اپنی ملکیت نہ سمجھے، بلکہ ''انفرادی ملکیت کے باوجود'' یہ یقین رکھے کہ وہ جس قدر زیادہ کمائے گا، اسی قدر اس کی دولت پر اجتماعی حقوق زیادہ عائد ہوں گے۔ پس وہ صرف اپنے لیے نہیں کماتا، بلکہ جماعت کے دوسرے افراد کے لیے بھی کماتا ہے۔

تفاوتِ درجات کا درست مفہوم

نیز یہ ذہن نشین رہے کہ درجات کا یہ تفاوت جماعت کے دوسرے افراد کو محرومُ المعیشت (معیشت سے محروم) بنانے اور ذاتی اغراض کی خاطر معاشی دست بُرد کرنے کے لیے نہیں ہے۔ جو ایسا کرتا ہے، وہ خدا کی نعمت (عطائے ثروت) کا جاحد (منکر) ہے۔ کیوں کہ یہاں دولت و سرمایہ کا مقصد زیادہ سے زیادہ نفع بازی نہیں ہے، بلکہ انفرادی حاجات و ضروریات کے ساتھ ساتھ اجتماعی حاجات و ضروریات کی تکمیل ہے۔

دوسری جانب غیر متموّل (مال دار نہ ہونے والے) سے یہ توقع کرتا ہے کہ وہ متموّل افرادِ ملت کے تموُّل (مال داری) کو دیکھ کر خدا کے ساتھ کفران اور ناشکر گزاری نہ اختیار کرے اور نہ حسد و بغض کو دل میں جگہ دے، بلکہ طمانیتِ قلب کے ساتھ اپنی مختصر فارغ البالی اور خوش حالی پر شاکر رہے۔ — لفظ ''فارغ البالی'' اس لیے کہا گیا ہے کہ اسلامی نظامِ حکومت میں کسی فرد کا محروم المعیشت رہنا ناجائز ہے — یا پھر عملی جدوجہد میں آگے بڑھ کر اپنی استعداد و صلاحیت کے مطابق ان تمام حقوقِ معیشت سے متمتع ہو اور غنا و دولت حاصل کرے، جن کو تمام مخلوقِ خدا کے لیے عام اور مساوی کر دیا ہے۔ وہ دوسرے افرادِ ملت کے حقوق اور ان کی ذمہ داریوں کو اپنے حاصل کردہ مال پر اسی طرح عائد کرے، جس طرح قانونِ اسلامی نے دوسرے اربابِ دولت پر عائد کیے ہیں۔

(معاشیات کے پہلے اصول ''حقِ معیشت میں مساوات'' کے تحت جب قدرتی اور ملکی وسائل میں تمام انسانوں کو استفادے کا حق ہے اور اُس میں وہ دولت کی پیدائش کے لیے یکساں طور پر محنت و جدوجہد اور کوشش کریں گے تو محنتوں اور صلاحیتوں کے فرق و امتیاز کی وَجہ سے دوسرے اصول کے مطابق درجاتِ معیشت میں فطری فرق ہوسکتا ہے۔ حکومت کی ذمہ داری ہے کہ وہ ایسا ماحول پیدا کرے کہ جس میں تمام لوگوں کی محنت محفوظ ہو۔ اُن کے تمام حقوق کی ادائیگی اور بہتر ماحول فراہم کرنے کی ذمہ داری حکومت ادا کرے۔ اس طرح لوگوں کے درمیان معیشت میں درجات کا فرق اور امتیاز فطری حد تک ہوسکتا ہے۔ معاشی درجات میں ایسا تفاوت کہ جس کے نتیجے میں طبقاتی نظام وجود میں آئے اور سرمایہ پرست لوگ دوسروں کی محنتوں کا استحصال کرتے ہوں، درست نہیں ہے۔ مرتب)

www.rahimia.org

تیسرا اُصول: اِحتکار و اِکتناز کی حرمت

دولت اور سرمایہ داری کے وہ اصول قطعاً ناقابلِ تسلیم ہیں جن میں ''احتکار'' (اَجناس کی ذخیرہ اندوزی) و''اکتناز'' (زرکی ذخیرہ اندوزی) کی کوئی صورت بھی بن سکے اور ان سے دولت وکنز پھیلنے اور تقسیم ہونے کے بجائے سمٹ کر خاص حلقوں اور مخصوص طبقوں میں محدود ہو کر رہ جائے۔ اس طرح عام انسانی زندگی کو مفلوک الحال بنا دے۔

احتکار واکتناز کی حرمت اور ''انفاق'' کے وجوب کے لیے ذیل کی آیات قابلِ توجہ ہیں:

(1) وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنْفِقُوْنَهَا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۙ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ﴿٣٤﴾ يَّوْمَ يُحْمٰى عَلَيْهَا فِيْ نَارِ جَهَنَّمَ فَتُكْوٰى بِهَا جِبَاهُهُمْ وَجُنُوْبُهُمْ وَظُهُوْرُهُمْ ۭ هٰذَا مَا كَنَزْتُمْ لِاَنْفُسِكُمْ فَذُوْقُوْا مَا كُنْتُمْ تَكْنِزُوْنَ ﴿٣٥﴾ [32]

(اور جولوگ خزانہ بنا کر رکھتے ہیں سونے اور چاندی کو اور اس کو اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے، سو اُن کو دردناک عذاب کی خوش خبری دے دو! جس روز کہ اس مال پر جہنم کی آگ دہکائی جائے گی۔ پھر اس سے داغی جائیں گی ان کی پیشانیاں، پہلو اور ان کی پیٹھ (اور کہا جائے گا) یہ ہے وہ خزانہ جو تم نے اپنے واسطے گاڑ رکھا تھا اور چکھو مزہ اپنے گاڑنے کا۔)

(2) كَيْ لَا يَكُوْنَ دُوْلَةًۢ بَيْنَ الْاَغْنِيَاۗءِ مِنْكُمْ ۭ [33] (فقرا ومساکین، قرابت داروں اور یتیموں وغیرہ پر اللہ نے جو خرچ کرنے کا یہ طریقہ بتایا ہے، اس لیے ہے تا کہ ایسا نہ ہو کہ مال و دولت صرف دولت مندوں ہی میں محدود ہو کر رہ جائے۔)

(3) اِنَّمَا الصَّدَقٰتُ لِلْفُقَرَاۗءِ وَالْمَسٰكِيْنِ وَالْعٰمِلِيْنَ عَلَيْهَا وَالْمُؤَلَّفَةِ قُلُوْبُهُمْ وَفِي الرِّقَابِ وَالْغٰرِمِيْنَ وَفِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَابْنِ السَّبِيْلِ ۭ فَرِيْضَةً مِّنَ اللّٰهِ ۭ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ﴿٦٠﴾ [34] (صدقات اَور کسی کے لیے نہیں ہیں، صرف فقیروں کے لیے اور ان کے لیے جو صدقات کے وصول کرنے پر مامور ہیں، اور ان کے لیے جن کے دلوں میں کلمہ حق کی اُلفت پیدا کرنی ہے، اور ان کے لیے جن کی گردنیں (غلامی سے) آزاد کرانی ہیں، اور قرض داروں کے لیے جو کہ قرض کے بوجھ سے دبے ہوئے ہیں، اور اللہ کی راہ میں صَرف کرنے کے لیے (یعنی مجاہدین اور اعلائے کلمۃ اللہ میں مصروف رہنے والوں کے لیے) اور مسافروں کے لیے، یہ اللہ کی جانب سے ٹھہرائی ہوئی بات ہے۔ اور اللہ سب کچھ جاننے والا حکمت والا ہے۔)

(4) وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ [35] (اور نماز قائم کرو اور زکوٰۃ دیتے رہو!)

(5) وَاَوْحَيْنَآ اِلَيْهِمْ فِعْلَ الْخَيْرٰتِ وَاِقَامَ الصَّلٰوةِ وَاِيْتَاۗءَ الزَّكٰوةِ ۚ وَكَانُوْا لَنَا عٰبِدِيْنَ ﴿٧٣﴾ [36]

(اور ہم نے ان کی جانب (انبیا علیہم السلام کی جانب) وحی کی نیک کاموں کے کرنے کی اور نماز قائم کرنے کی اور زکوٰۃ دینے کی اور وہ ہمارے عبادت گزار تھے۔)

(6) وَاَنْفِقُوْا مِنْ مَّا رَزَقْنٰكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ [37]

(اور جو ہم نے تم کو دیا ہے، اس میں سے اس سے پہلے ہی خرچ کرلو کہ تم میں سے کسی کے پاس موت آموجود ہو۔)

(7) وَاَنْفِقُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَلَا تُلْقُوْا بِاَيْدِيْكُمْ اِلَى التَّهْلُكَةِ ۚ [38] (اور اللہ کی راہ میں خرچ کرو اور اپنے ہاتھوں

www.rahimia.org

سے اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو (یعنی اِنفاق فی سبیل اللّٰہ سے رُکنا خود کو ہلاکت میں ڈالنا ہے۔)

ان آیات میں ادائے زکوٰۃ وصدقات اور ''اِنفاق فی سبیل اللّٰہ'' (اللہ کے راستے میں خرچ کرنے) کا حکم دیا گیا ہے اور قرآن حکیم میں بہت بڑا ذخیرہ ان ہی احکام کی ترغیب وترہیب، ان سے متعلق احکام اور تفصیلات پر مبنی ہے۔ ان سب (احکام) کی روح یہ ہے کہ دولت وثروت جمع و ذخیرہ کے لیے نہیں ہے، بلکہ صَرف وخرچ کے لیے ہے۔ اس کا مصرف ذاتی وانفرادی تعیش کے بجائے انفرادی واجتماعی ضروریات کی کفالت ہے۔

احتکار و اکتناز کی حقیقت؛ جمہور علما کا مؤقف

اسی لیے ان آیات کی تفسیر میں ''جمہور'' کا مسلک یہ ہے کہ جس مال میں سے زکوٰۃ اور دوسرے مالی فرائض ادا نہ کیے گئے ہوں تو وہ مال احتکار و اکتناز کی فہرست میں شامل اور (آیتِ قرآنی میں بیان کردہ) ''کَنز'' (دولت جمع کرنے) سے متعلق وعید کا مصداق ہے۔ اور اسی قسم کی دولت وثروت کا نام ''سرمایہ داری'' ہے اور یہ حرام اور باطل ہے اور تباہ کر دینے کے قابل۔

اور اپنی ضروریات اور اہل وعیال کی ''حاجاتِ اصلیہ'' اور مالی فرائض و واجبات کے ادا کے بعد بھی دولت باقی بچے تو اس کا پس انداز کرنا اگرچہ جائز ہے، مگر خلافِ اولیٰ ہے۔ کیوں کہ اب اس مال پر اجتماعی حقوق عائد ہو چکے ہیں اور اب اس کو اجتماعی حاجات میں صَرف ہونا چاہیے۔ مصارف کے موقع پر ہم نے جگہ جگہ لفظِ ''حاجات'' کے ساتھ ''اصلیہ'' کا اضافہ کیا ہے۔ یہ اس لیے ہے کہ وہ تمام اخراجات ومصارف نظامِ اسلامی میں غیر معتبر اور باطل ہیں، جو اس کی نگاہ میں ممنوع یا حرام ہیں۔

احتکار و اکتناز کے بارے میں حضرت ابوذر غفاریؓ کا مؤقف

جمہور کے خلاف حضرت ابوذر غفاریؓ اور بعض علمائے اسلام اس کو بھی جمع کر کے رکھنا حرام بتاتے ہیں۔

(چناں چہ علامہ ابن کثیرؒ اُن کا مسلک بیان کرتے ہوئے ''تفسیر ابنِ کثیرؒ'' میں لکھتے ہیں:

''**کان من مذهب ابی ذرّ رضی اللّٰه عنه تحريم ادّخار ما زاد علٰی نفقة العيال، و کان يفتی بذٰلک، و يحثّهم عليه، و يأمرهم به.**'' [39] (حضرت ابوذر غفاریؓ کا مذہب یہ تھا کہ اہل وعیال کے نفقہ سے زیادہ روپیہ جمع رکھنا قطعاً حرام ہے۔ وہ اسی کا فتویٰ دیتے، اسی کی تبلیغ کرتے، اور اسی کا سب کو حکم دیتے۔)

اور ان آیاتِ زکوٰۃ وصدقات اور منع احتکار و اکتناز کے علاوہ آیاتِ میراث اور قانونِ وراثت بھی اسی حقیقت پر مبنی ہے کہ دولت وثروت جمع و ذخیرے کے لیے نہیں ہے، بلکہ تقسیم اور پھیلنے کے لیے ہے، تاکہ اس کا افادہ زیادہ سے زیادہ وسیع ہو سکے۔

چوتھا اصول: سرمایہ ومحنت میں عادلانہ توازن

قرآنی نقطہ نظر سے معیشت کا چوتھا اصول فاسد نظامِ معیشت کا انسداد اور سرمایہ اور محنت میں عادلانہ توازن قائم کرنا ہے۔ خرید وفروخت اور لین دین کے معاملات میں کوئی ایسا معاملہ جائز نہیں، جس سے فاسد نظامِ معیشت بروئے کار آئے، یا اس کو کسی قسم کی بھی اعانت پہنچے، یا محنت اور معیشت کے لیے جائز جدوجہد بے حقیقت ہو کر رہ جائے اور اس طرح محنت اور سرمایہ کے درمیان اعتدال اور توازن باقی نہ رہے۔ اسی لیے اس نے ربٰو (سود) کے ہر قسم کے تجارتی کاروبار قمار (جوا) کی تمام ظاہری وخفی،

www.rahimia.org

اقسام و اصناف، احتکار و اکتناز کی تمام اشکال اور اسی طرح کے عقودِ فاسدہ کی دوسری تمام صورتوں کو ناجائز اور مردود قرار دیا اور معاملات کے کسی شعبہ میں بھی ''فاسد معاشیات'' کو دخیل اور بروئے کار نہیں آنے دیا اور دوسرے شعبوں کی طرح معاملات کے اس شعبے میں بھی عدل وانصاف ہی کو اساس و بنیاد قرار دیا ہے:

چناں چہ (قرآن حکیم کی) حسبِ ذیل تصریحات اس کی شاہد ہیں:

(1) اَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا [40]

(اللہ نے خرید وفروخت کے معاملات کو حلال کیا ہے اور سودی کاروبار کو حرام کر دیا ہے۔)

(2) يَمْحَقُ اللّٰهُ الرِّبٰوا وَيُرْبِي الصَّدَقٰتِ ۗ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ كَفَّارٍ اَثِيْمٍ ﴿٢٧٦﴾ [41]

(اللہ تعالیٰ سودی کاروبار کو مٹاتا ہے اور صدقات وخیرات کو ترقی دیتا ہے اور اللہ تعالیٰ کسی ناشکر گزار گناہ گار کو دوست نہیں رکھتا۔)

(3) اِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْاَنْصَابُ وَالْاَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ فَاجْتَنِبُوْهُ [42]

(بے شک شراب، جوا، بت اور پانسے ناپاک ہیں، کارِ شیطان ہیں، پس ان سے بچو!)

(4) وَيْلٌ لِّلْمُطَفِّفِيْنَ ﴿١﴾ الَّذِيْنَ اِذَا اكْتَالُوْا عَلَى النَّاسِ يَسْتَوْفُوْنَ ﴿٢﴾ وَاِذَا كَالُوْهُمْ اَوْ وَّزَنُوْهُمْ يُخْسِرُوْنَ ﴿٣﴾ [43] (خرابی ہے کمی کرنے والوں کے لیے۔ ان لوگوں کے لیے کہ جب ماپ تول کر لیں تو لوگوں سے تو پورا پورا بھر لیں اور جب ان کو ماپ کر یا تول کر دیں تو گھٹا کر دیں۔)

(5) وَزِنُوْا بِالْقِسْطَاسِ الْمُسْتَقِيْمِ ﴿١٨٢﴾ [44] (اور تول کر دو برابر وزن کے ساتھ!)

(6) يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْكُلُوْۤا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ اِلَّاۤ اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِّنْكُمْ [45]

(اے ایمان والو! آپس میں ایک دوسرے کا مال باطل (ناجائز طریقہ) سے نہ کھاؤ، ہاں اگر آپس کی رضا مندی سے تجارت ہو تو اس طرح کھا سکتے ہو (گویا ہر شخص اپنے حصے کے مطابق اپنا حق لے۔)

اسلام کا اقتصادی نظام؛ امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی نظر میں

چناں چہ حضرت شاہ ولی اللہ (دہلوی نور اللہ مرقدہ) ''حُجّةُ اللّٰه البالغه'' میں اسی اساسی اصول کی روشنی میں ''باب من أبواب ابتغاء الرّزق'' کے عنوان سے حسبِ ذیل نہایت پُر شوکت اور مدلل مضمون تحریر فرماتے ہیں:

1۔ محنت کی عظمت واہمیت

''یہ واضح رہے کہ اللہ تعالیٰ نے جب مخلوق کو پیدا کیا اور زمین میں ان کی معاشی حیات کے لیے سب کچھ سامان فراہم کر دیا اور ان سب کو سب کے لیے مباح اور عام کر دیا تو ان سے متمتع ہونے میں مخلوقات کے درمیان مزاحمت اور مناقشت شروع ہوگئی۔ تب اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ:

(الف) جب کوئی شخص (محنت ومشقت کر کے) سبقت اور پہل کر کے کسی (قدرتی) شیئ کو اپنے قبضے میں کر لے،

(ب) یا مورث (نے محنت کی اور اس) کے قبضے کی وجہ سے اس کی وراثت میں آجائے،

www.rahimia.org

(ج) یا ان کے علاوہ ایسے دوسرے طریقوں سے اس کا قبضہ ہو جائے جو اللہ تعالیٰ کے نزدیک جائز طریقے قرار پا چکے ہیں تو ایسی صورت میں اب کسی دوسرے شخص کو اس کی (حاصل کردہ) مقبوضہ شئے میں مزاحمت کا حق نہیں ہے۔

البتہ دوسرے کی مقبوضہ شئے کو حاصل کرنے کا جائز طریقہ یہ ہے کہ:

(i) یا خرید وفروخت اور لین دین کے ذریعے تبادلے کی شکل پیدا کرے،

(ii) یا معتبر طریقوں سے باہمی رضامندی کا معاملہ اس طرح انجام پاجائے کہ ہر دو جانب میں اس کے متعلق صحیح علم ہو اور اس معاملے میں نہ اِلتباس (دونوں طرف سے کوئی اُلجھاؤ) اور دھوکے کا دخل ہو اور نہ خلط ملط کرنے کی کوشش کی گئی ہو۔

2۔ اجتماعی اور معاشی زندگی میں تعاونِ باہمی کی اہمیت

نیز جب کہ انسان مدنی الطبع (فطری طور پر اجتماعیت پسند) واقع ہوئے ہیں تو ان کی معاشی زندگی باہمی تعاون و اشتراک کے بغیر ناممکن ہے۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ نے تعاون اور باہمی اشتراکِ عمل کو واجب کر دیا اور یہ بھی لازم قرار دیا کہ کسی فرد کو بھی ایسے امور سے کنارہ کش ہونے کا حق حاصل نہیں ہے، جو تمدن میں دخیل ہیں، مگر یہ کہ کسی شخص کو بعض مجبور کن حالات ایسا کرنے پر مجبور کر دیں۔

3۔ معیشت کے حصول کے بنیادی اسباب؛ زراعت، تجارت اور صنعت

نیز اسبابِ معیشت کے ''اسباب'' بننے میں اصل الاصول یہ ہے کہ:

(الف) اموالِ مباح (قدرتی وسائل) میں سے کسی شئے کو اپنے قبضے میں لیا جائے،

(ب) یا ان اموالِ مباح کے وسیلے سے جو کہ (محنت کرکے) مالی ترقی کا ذریعہ بنا کرتے ہیں، اپنے مقبوضہ اور مشخّصہ مال کو ترقی دی جائے۔ مثلاً:

(i) چرائی (کی محنت) کے ذریعے سے چوپایوں کی افزائشِ نسل کرنا،

(ii) یا زمین کی درستی اور پانی کی سیرابی کے ذریعے سے زراعت و کاشت کاری کرنا،

لیکن مالِ مباح (قدرتی اشیا) کو اپنے لیے خاص کرنے یا دوسرے مباح اموال کو اپنے مال کی ترقی کا ذریعہ بنانے میں شرطِ اوّلین یہ ہے کہ یہ تصرفات اس طرح عمل میں نہ آنے پائیں کہ ایک فرد دوسرے فرد کے لیے معاشی ذرائع کی تنگی اور ضیق کا باعث بن جائے اور اس طرح تمدن کو فاسد اور برباد کر دے۔''[46]

یعنی جب کہ حلال وسائلِ معاش سب کے لیے یکساں طور پر مباح الاصل (اصل میں سب کے لیے جائز) ہیں تو اب کسی شخص کو اپنی شخصی معاش کے لیے اسی قدر اس میں تصرف اور دعویٰ ملکیت جائز ہے کہ اس کا یہ عمل دوسروں کی معاشی زندگی کی پریشانی کا باعث نہ بن جائے اور اس کی دولت مندی دوسروں کے افلاس اور فقر وفاقہ کا سبب نہ ثابت ہو۔

(امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ مزید فرماتے ہیں:)

''پھر یہ بات بھی پیشِ نظر رہنا ضروری ہے کہ اگر ''معاشی معاملات'' میں لوگوں کے درمیان باہمی تعاون و

www.rahimia.org

اشتراکِ عمل کے ذریعے مالی ترقی و نمود بروئے کار نہ آئے تو تمدن کا صالح اور صحیح رہنا دشوار سے دشوار تر ہو جائے گا:

(الف) مثلاً ایک چاہتا ہے کہ وہ تجارتی مال کو ایک شہر سے دوسرے شہر میں لے جائے اور ایک معین مدت کے لیے وہ اس ایاب و ذھاب (آنے جانے) کی گارنٹی چاہتا ہے (یعنی تجارت کو ذریعہ معاش بناتا ہے)۔

(ب) یا مثلاً ایک دوسرا شخص اپنی عملی جدوجہد کے ذریعے دوسروں کے مال (کو فروخت کرنے) کی دلالی (Sale) کرتا ہے (یعنی محنت کو ذریعۂ معاش بناتا ہے)۔

(ج) یا ایک تیسرا شخص اپنی نئی نئی پسندیدہ ایجادات کے ذریعے دوسروں کے مال کو بیش قیمت اور بہتر بناتا ہے (یعنی صنعت و حرفت کو وسیلہ معاش بناتا ہے)۔

(د) اور اس طرح دوسرے جائز طریقے اختیار کرتا ہے

(تو ان سب صورتوں میں تعاون کے بغیر معاشی زندگی میں استواری پیدا نہیں ہوسکتی)۔ بہر حال ان تمام معاملات میں صحیح تعاون و اشتراکِ عمل ضروری اور واجب ہے۔

اگر یہ مالی ترقی ایسے طریقے سے کی جائے کہ اس میں سرے سے تعاون کا کوئی دخل ہی نہ ہو:

(الف) جیسا کہ قمار (جوا) کا کاروبار ہے،

(ب) یا ایسے طریقہ سے عمل میں آئے کہ بہ ظاہر تو تعاون نظر آتا ہو، لیکن حقیقت میں وہ زبردستی کا تعاون ہو، حقیقی تعاون نہ ہو۔ جیسا کہ مثلاً ربا (سود) کا کاروبار ہے۔

مجبور محنت کش کی رضا مندی، حقیقی رضا مندی نہیں ہے

یہ بات بہت صاف ہے کہ ایک مفلس اور نادار اپنی معاشی پریشانیوں کی وجہ سے اپنے ذمہ ایسی ذمہ داریوں کو لینے کے لیے مضطر و مجبور ہو جاتا ہے، جن کو پورا کرنے کی اپنے میں طاقت نہیں پاتا اور اس کی اس قسم کی رضا مندی ہرگز رضامندی نہیں کہلائی جاسکتی۔

پس اس طرح کے کاروبار نہ پسندیدہ اور نہ ہی جائز معاملات کہلائے جاسکتے ہیں اور نہ ان کو معاشیات کے اسبابِ صالحہ کہا جاسکتا ہے۔ بلاشبہ اس قسم کے تمام معاملات حکمتِ تمدن کی نگاہ میں باطل اور ظلم ہیں۔'' (46)

ولی اللّٰہی معاشی تعلیمات کے بنیادی نکات

حضرت شاہ (ولی اللہ) صاحبؒ کی اس عبارت سے صرف اس آخری اصول ہی پر روشنی نہیں پڑتی، بلکہ اصول چہارگانہ (۱۔حقِ معیشت میں مساوات، ۲۔ درجاتِ معیشت میں فطرتی تفاوت، ۳۔ احتکار و اکتناز کی ممانعت، ۴۔ سرمایہ اور محنت میں عادلانہ توازن) کی ایک جامع اور مبسوط تفصیل سامنے آجاتی ہے، یعنی:

1۔حقِ معیشت میں برابری:

معیشت میں فطری تفاوتِ درجات کے باوجود تمام مخلوق یکساں اور برابر ہے، یعنی حقِ معیشت میں برابر ہے۔ اور خدا تعالیٰ نے تمام معاشی وسائل میں زمین اور پیداوارِ زمین کو سب کے لیے مباح الاصل پیدا کیا ہے۔ اور تعیین و تشخیص جائز قبضے سے ہی

www.rahimia.org

وجود میں آتی ہے۔

2۔ معاشی تنگی پیدا کرنا ناجائز ہے

کسی فرد کو ان اموالِ مباح میں اسی قدر اور اسی طریق سے قبضہ و تصرف جائز ہے کہ اس سے دوسرے فرد کے لیے معاشی ضیق کے اسباب پیدا نہ ہو جائیں۔

3۔ تعاونِ باہمی ضروری ہے

نیز معاشی معاملات میں ''باہمی تعاون و اشتراکِ عمل'' واجب اور ضروری ہے۔

4۔ صحیح طریقوں پر تعاونِ باہمی جائز ہے

اور یہ تعاون ایسے صحیح اور سالم طریقوں پر مبنی ہونا چاہیے کہ اس سے نظامِ تمدن میں ابتری نہ پھیل جائے، یعنی ان کے ذریعے معاشی معاملات میں ایک دوسرے کو مدد ملے نہ کہ ایک کا فائدہ دوسرے کی مضرت (اور نقصان) پر موقوف ہو۔

5۔ صالح معاشی نظام خدا کا حکم ہے

یہ جب ممکن ہے کہ کائنات میں ایک ''صالح معاشی نظام'' موجود ہو، جو خدائے تعالیٰ کے حکم اور منشا کو پورا کرتا ہو۔

6۔ تعاونِ باہمی کے بغیر تمام معاملات ناجائز ہیں

پس اس ''صالح معاشی نظام'' میں وہ تمام معاملات ناجائز اور حرام ہیں، جن میں تعاونِ باہمی کا مطلق دخل ہی نہ ہو، بلکہ ایک فرد کی تباہی اور مضرت پر جو دوسرے فرد کی مالی منفعت کا مدار ہو، جیسا کہ قمار (جوا) خواہ وہ غیر مہذب طریقوں سے عمل میں آئے، یا سٹہ اور لاٹری وغیرہ مہذب طریقہ ہائے تجارت کے ذریعے سے ہو۔

7۔ معاملات میں زبردستی کا تعاون اور رضامندی ناجائز ہے

وہ معاملات بھی ناجائز اور حرام ہیں، جن میں بہ ظاہر اگرچہ باہمی رضامندی اور تعاون نظر آتا ہو، لیکن اس کی تہہ میں زبردستی کے سوا اَور کچھ نہ ہو۔ جیسا کہ مثلاً ربوٰ (سودی لین دین) اور ایسے تمام اجارات و معاملات، جن میں ایک جانب سرمایہ دار کا ''سرمایہ'' ہے اور دوسری جانب ایک مفلس و نادار کی (مجبوری اور) اضطراری ضرورت ہو۔ سرمایہ دار مفلس کے افلاس اور اس کی اضطراری حاجت سے فائدہ اٹھاتا ہے اور اجارہ، رہن اور دوسرے معاملاتِ لین دین میں اس سے ایسی شرائط منظور کرا لیتا ہے، جو انصاف اور عدل کی نگاہ میں کسی طرح جائز نہیں تھیں، مگر مفلس کے افلاس اور ضرورت مند کی ضرورت نے ان کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنے پر مجبور کر دیا۔

8۔ ایک مخصوص طبقے کی اجارہ داری ناجائز ہے

پس اس قسم کے تمام معاملات اگرچہ باہمی رضامندی سے بھی طے پا جائیں، تب بھی اسلام اور خدائے کائنات کے نزدیک باطل اور ظلم ہیں۔ اور ''صالح معاشی نظام'' میں ان کے لیے کوئی جگہ نہیں۔ خواہ ان کے ظاہری فائدے کتنے ہی خوش گوار کیوں نہ

www.rahimia.org

ہوں۔ اس لیے کہ اس قسم کے کاروبار کا آخری نتیجہ عوام کی فلاکت (بدحالی) و افلاس اور ایک مخصوص طبقے کی اجارہ داری کے سوا اَور کچھ نہیں ہے۔ اس لیے:

(الف) یہاں مہاجنی سود کا کاروبار بھی ملعون ہے۔

(ب) اور سودی بینکوں کا سسٹم بھی مذموم و مطرود (مردود) ہے۔

(ج) اور یہاں مستاجروں کے وہ تمام طریقہ ہائے تجارت بھی حرام ہیں، جن میں اجیر کے جائز اور عادلانہ اُجرت و حقوق کی حق تلفی ہو اور اس کے اضطرار اور پریشان حالی سے ناجائز فائدہ اٹھایا جاتا ہو۔

(د) اجیر (مزدور) کی وہ خیانت بھی ناجائز جس سے صاحبِ سرمایہ کو ناحق نقصان پہنچانے کی سعی کی جائے۔

اسلام کے اقتصادی نظام کی جامعیت

بہر حال ''معاشی نظام سے متعلق'' ان آیات میں قرآنِ عزیز نے جن نصوصِ قطعیہ کو بیان کیا ہے، اور معجزانہ بلاغت اور حکیمانہ اسلوب کے ساتھ رہنمائی فرمائی ہے، اسلام کا معاشی نظام انھی نوامیسِ الٰہی (اللہ کی کتاب اور احکامات) کی شرح وتفسیر ہے۔ پس (اس کتاب ''اسلام کا اقتصادی نظام'' کے) آئندہ صفحات میں جو کچھ بھی سپرد ِقلم ہوگا، وہ صرف ان ہی حقائق کی تفصیلات ہوں گی کہ یہی درحقیقت ''صالح معاشی نظام'' کے لیے بہترین دلیلِ راہ ہیں اور اس کے وجود کے ضامن اور کفیل۔

اب ان تفصیلات سے یہ بہ خوبی اندازہ ہوسکتا ہے کہ ''معاشی نظام'' کا جو اساسی مقصد ہے، اس کو کامیاب بنانے کے لیے ''اسلام کے اقتصادی نظام'' کے علاوہ دوسری کوئی راہ نہیں ہے۔ یہاں (اسلام کے اقتصادی نظام میں:)

(الف) مارکسزم (اشتمالیت) کی طرح مذہبی انارکی بھی نہیں ہے اور طبقاتی جنگ بھی موجود نہیں، بلکہ ایک عالمگیر اخوت کا غیر فانی اعلان ہے۔

(ب) اور سرمایہ دارانہ نظام کی طرح دولت و وسائلِ دولت کو سمیٹ کر مخصوص طبقے کے حوالے کرنا بھی حرام قرار دیا گیا ہے، تا کہ باطل اور ظلم کی بنیادیں کسی حالت میں بھی اپنے قدم نہ جما سکیں اور دنیائے انسانی کے کسی ایک فرد کو بھی اپنی معاشی حیات میں انسانوں کے ہاتھوں میں ضیق اور تنگی پیدا نہ ہو۔

اب یہ ہمارا کام ہے کہ معاشیات کی علمی کاوشوں اور فنی بحثوں سے مرعوب ہو کر اس جال میں نہ پھنس جائیں، جس نے اَور سب کچھ تو کیا، مگر انسانی دنیا کو امن و سلامتی اور عام خوش حالی و رفاہیت سے کبھی روشناس نہ ہونے دیا اور اس طرح اپنی بدبختی پر اپنے ہاتھ سے مہر لگالی اور یا اس سادہ مگر امن و سلامتی کے شاہکار اسلام کے اقتصادی نظام کو اپنا قائد بنالیں کہ دوست اور دشمن دونوں آج تک اس کی ہمہ گیر اخوت و پیامِ مساوات اور عام معاشی خوش حالی و رفاہیت کے معترف ہیں۔

----

www.rahimia.org

حوالہ جات وحواشی

1۔ البدایہ والنہایہ، (ابن کثیرؒ)، ج:5، ص 64، طبع: بیروت۔
2۔ القرآن 30:50۔
3۔ ترجمان القرآن، ازمولانا ابوالکلام آزاد، ج:2، ص 132، طبع: لاہور۔
4۔ القرآن 6:11۔
5۔ القرآن 22:51۔
6۔ القرآن 31:17۔
7۔ القرآن 64:27۔
8۔ القرآن 58:51۔
9۔ القرآن 20:15۔
10۔ القرآن 29:2۔
11۔ القرآن 10:41۔
12۔ القرآن 71:16۔
13۔ روحُ المعانی فی تفسیر القرآن العظیم و سبع المثانی، سورۃ النّحل، ج: 14، ص: 74-273، طبع: دار احیاء التراث العربی، بیروت، لبنان۔
14۔ البحر المحیط، از امام ابوحیان محمد بن یوسف اندلسی غرناطی، ج:5، سورت النحل۔ وتفسیر فتح القدیر از امام محمد بن علی شوکانی، ج:3، 47-246، طبع: لجنة التحقیق و البحث العلمی بدار الوفاء۔
15۔ القرآن 29:2۔
16۔ إیضاح الادلّه، از حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ، ص: 68، طبع: دیوبند۔
17۔ المُحلّٰی، از العلامہ علی بن احمد الحزم، ج:6، ص: 87-157، طبع: دارالجیل، بیروت۔
18۔ ایضاً، ج:6، ص: 158۔
19۔ ایضاً ج:6، ص: 158، و کتاب الخراج، قاضی ابویوسف، ص 50، طبع: بیروت۔
20۔ المُحلّٰی، ج:6، ص: 158۔
21۔ ایضاً۔
22۔ ایضاً۔
23۔ القرآن 10:90
24۔ کتاب الخراج، از امام قاضی ابویوسفؒ، ص 45، طبع: بیروت۔
25۔ ایضاً۔
26۔ ایضاً۔
27۔ ایضاً، ص 50۔
28۔ القرآن 32:43۔
29۔ القرآن 26:13۔
30۔ القرآن 165:6۔
31۔ القرآن 71:16۔
32۔ القرآن 9:35-34۔
33۔ القرآن 7:59۔
34۔ القرآن 60:9۔
35۔ القرآن 43:2۔
36۔ القرآن 73:21۔
37۔ القرآن 10:63۔
38۔ القرآن 195:2۔
39۔ تفسیر ابن کثیر، سورہ توبہ (آیت ''و الّذین یکنزون الذّھب'' کے ذیل میں)
40۔ القرآن 275:2۔
41۔ القرآن 276:2۔
42۔ القرآن 90:5۔
43۔ القرآن 3:83-1۔
44۔ القرآن 182:26۔
45۔ القرآن 29:4۔
46۔ حُجَّةُ اللّٰه البالغه، از امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ، من ابواب ابتغاء الرّزق، ج:2، ص 74-273، طبع: مکتبہ حجاز، دیوبند۔
47۔ ایضاً، ص 274۔

☆

www.rahimia.org

مطالعۂ معاشیات

سرمایہ اور محنت میں عادلانہ توازن

تحریر: مفتی عبدالخالق آزادرائے پوری

(یہ مقالہ 1995ء میں تحریر کیا گیا تھا۔ پھر سینئر احباب کی ایک مجلس میں اس کے تمام پہلوؤں پر غور وفکر کیا گیا۔ احباب کی آرا کی روشنی میں اس پر نظرِ ثانی کی گئی اور پھر مئی 1995ء میں ''عزم سیریز'' نمبر 140 میں طبع ہوا تھا۔ اب دوبارہ مصنف کی نظرِ ثانی کے بعد قارئین کی خدمت میں پیش کیا جارہا ہے۔ مدیر)

سرمایہ اور محنت سے متعلق جاری بحث

معاشیات میں ''سرمایہ'' (Capital) اور ''محنت'' (Labour) کے متعینہ کردار سے متعلق بحث اپنی نوعیت کے اعتبار سے خاصی اہمیت کی حامل ہے۔ علمِ معاشیات میں چوں کہ انسانی زندگی کی ''معاشی احتیاجات'' اور ان کی ''تسکین'' کے حوالے سے ''پیدائشِ دولت'' (Production of Wealth) اور ''تقسیمِ دولت'' (Distribution of Wealth) پر بحث کی جاتی ہے، یوں دولت کی پیدائش اور اس کی متوازن تقسیم میں سرمایہ اور محنت کے کردار کا تعین گویا معاشیات کی بنیادی اور اہم مباحث میں سے ہے۔ یہی وَجہ ہے کہ ہر ایک نظامِ معیشت اس حوالے سے بحث کو اوّلیت دیتا ہے۔

یوں تو دنیا میں بہت سے نظریات اور افکار زیرگردش ہیں۔ اس حوالے سے مختلف نظام ہائے حیات اپنے اپنے افکار و خیالات پیش کرتے ہیں۔ سرمایہ اور محنت کی بحث بھی ان نظریات و افکار کے حوالے سے تہی دامن نہیں ہے۔ خاص طور پر اس صورتِ حال میں، جب کہ سرمائے کو بہ طور ایک استحصالی قوت اور انسانی محنت کو بہ طور ایک کمزور عامل کی حیثیت دینے کے لیے طرح طرح کے بے سروپا خیالات کا اظہار کیا جاتا ہے۔ چناں چہ اس قسم کے ذہنی تخیلات تشکیل دے کر نظریات و افکار کی عمارت کھڑی کی جاتی ہے، جن کا حقیقت کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ ایسے میں یہ ضروری ہوجاتا ہے کہ اعتدال اور توازن کے ساتھ اس اہم ترین معاشی مسئلے پر گفتگو کی جائے اور اِدھر اُدھر بھٹکنے کے بجائے انسانی زندگی میں تعاونِ باہمی کی روح کو سامنے رکھتے ہوئے اس مسئلے کی وضاحت کی جائے۔

اس بحث کا پیدائشِ دولت سے تعلق

چوں کہ معاشیات کے عمومی قواعد کی رُو سے تقسیمِ دولت کا انحصار پیدائشِ دولت کے عوامل (Factors of Production) پر رکھا گیا ہے، اس لیے کہا جاتا ہے کہ جو عوامل پیدائشِ دولت میں اپنا کردار ادا کرتے ہیں، دولت کی تقسیم میں ان کا ہی حصہ ہوتا ہے۔ علمِ معاشیات کا عمومی ضابطہ یہی بیان کیا جاتا ہے۔ چناں چہ ''تقسیمِ دولت'' پر بحث سے قبل ''پیدائشِ دولت'' کے عوامل پر

www.rahimia.org

گفتگو کی جاتی ہے۔ اس طرح عواملِ پیدائش دولت کی بحث کا آغاز ہوجاتا ہے۔

پیدائش دولت کے مبینہ عوامل

عام طور پر مفکرینِ معاشیات اس بات پر زور دیتے ہیں کہ پیدائشِ دولت کے چار عوامل ہیں:

1۔ زمین(Land) 2۔ سرمایہ(Capital) 3۔ محنت(Labour) 4۔ تنظیم(Organization)

1۔ زمین (Land)

اس سے مراد صرف سطحِ ارض ہی نہیں، بلکہ وہ تمام مادے اور قوتیں اس عنوان میں شامل ہیں، جنھیں قدرت نے انسان کے واسطے زمین، پانی، ہوا، روشنی اور حرارت وتوانائی کی صورت میں پیدا کیا ہے۔

2۔ سرمایہ (Capital)

اس سے مراد وہ تمام اموال ہیں، جو زمین یعنی قدرتی مادی اشیا اور انسانی محنت کے تعاون سے وجود میں آتے ہیں اور پھر مزید دولت پیدا کرنے کا ذریعہ بنتے ہیں۔ ایسا مال جو ذاتی تصرف میں استعمال ہوجائے، دولت(Wealth) کہلاتا ہے۔ جب کہ سرمایہ کا اطلاق مزید دولت پیدا کرنے کے لیے استعمال کی جانے والی نمو پذیر اشیا واموال پر ہوتا ہے۔

3۔ محنت(Labour)

معاشیات میں محنت سے مراد انسان کا ذہنی یا جسمانی نفع پہنچانے کا ہر وہ کام ہے، جسے معاوضہ اور اُجرت (Wages) حاصل کرنے کے لیے کیا جاتا ہے۔ روحانی لذت یا آخرت کے فائدے کے حصول، جسمانی ورزش یا کسی کو نقصان پہنچانے (مثلاً کسی کا مال چوری، ڈاکہ زنی، قتل و غارت گری) اور بغیر معاوضہ لیے محض خدمت کے طور پر کیے جانے والے کام' معاشی محنت کے زمرے میں نہیں آتے۔

4۔ تنظیم(Organization)

اس سے مراد ایسی تنظیم اور منصوبہ بندی ہے، جو ایک ماہرِفن ان مذکورہ بالا تینوں عوامل کو باہم مربوط کرنے کے لیے اختیار کرتا ہے اور اس سے زیادہ سے زیادہ نتائج حاصل کرنے کے لیے اپنی تنظیمی صلاحیتوں کو بروئے کار لاتا ہے۔

معاشیات میں عمومی طور پر یہی کہا جاتا ہے کہ یہ چار عوامل' پیدائشِ دولت میں اپنا اپنا کردار ادا کرتے ہیں، لہٰذا تقسیمِ دولت بھی اسی حوالے سے ہوگی۔

''سرمایہ'' اور ''محنت''؛ اصل عاملینِ پیدائشِ دولت

بادی النظر میں یہ چار عوامل شاید اسی طرح محسوس ہوں، جس طرح انھیں بیان کیا جاتا ہے، لیکن بہ غور مطالعہ اس جانب رہنمائی کرتا ہے کہ پیدائشِ دولت کے اہم اور بنیادی عوامل (Factors) جنھیں اس حوالے سے زیرِبحث لایا جاسکتا ہے، ''سرمایہ'' اور ''محنت'' ہیں۔ تنظیم چوں کہ کسی انسان کی تنظیمی صلاحیتوں کے اظہار کا نام ہے، جو کہ ذہنی اور جسمانی محنت کے امتزاج کا ہی

www.rahimia.org

دوسرا نام ہے، اس لیے وہ محنت سے ہٹ کر کوئی الگ اور مستقل عامل نہیں ہے۔ جیسا کہ محققین ماہرینِ معاشیات کی رائے ہے۔[1] اسی طرح ''زمین'' (Land) قدرتِ خداوندی کا عطیہ ہے۔ جب تک وہ قدرتی حالت میں رہتی ہے، کسی کی ملکیت میں نہیں ہوتی۔ وہ جب انسانی استعمال میں آتی ہے تو ''سرمایہ'' (Capital) یا ''دولت'' (Wealth) کے زمرے میں داخل ہو جاتی ہے۔ اس سے پہلے اپنی الگ اور مستقل کوئی حیثیت نہیں رکھتی کہ جس کا معاوضہ طے کیا جائے۔ اس طرح عواملِ پیدائشِ دولت کی بحث سمٹ کر سرمایہ اور محنت کے گرد گھومتی نظر آتی ہے۔

سرمایہ کے استحصالی کردار کا جائزہ

سرمایہ اور محنت کی بحث کے دوران سامراجی اور استحصالی ذہنیت کے حامل مفکرینِ معاشیات سرمایہ داری نظام (Capitalism) کو ثابت کرنے کے لیے سرمایہ کے عامل ہونے کی صلاحیت کا اظہار کچھ اس انداز میں کرتے ہیں کہ سرمایہ کی طاقت استحصالی قوت (Exploiting force) کے طور پر اُبھر کر سامنے آتی ہے۔ اس سے یوں محسوس ہوتا ہے کہ سرمایہ ایک معاون عامل ہونے کے بجائے اصل اور بنیادی عامل ہے، بلکہ استحصالی عامل کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس طرح مثبت سرمایہ کاری کے بجائے استحصالی سرمایہ داری نظام کی اساس اور بنیاد قائم کی جاتی ہے۔ بتلایا جاتا ہے کہ سرمایہ کے پاس سودا کاری (Bargaining) کی قوت بہت زیادہ ہے۔

جب یہی لوگ انسانی محنت کے بہ طور عامل ہونے کا ذکر کرتے ہیں تو اس کی حیثیت اس حد تک گرا دی جاتی ہے کہ اسے برابری تک کی بنیاد پر سودا کاری (Bargaining) کی قوت سے بھی محروم کر دیا جاتا ہے۔ جس سے عملاً انسانی محنت کی معاون عامل ہونے کی حیثیت بھی ختم ہو کر رہ جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عملی طور پر سرمایہ دارانہ نظام میں سرمایہ ایک استحصالی قوت (Exploiting force) کے طور پر سامنے آتا ہے۔ اس طرح انسانی محنت کی عظمت کو پسِ پشت ڈال دیا جاتا ہے۔ یوں سرمایہ کو معیشت کا محور و مرکز بنا کر معاشی استحصال 'لوٹ کھسوٹ' اور اقتصادی تباہ کاری کا دروازہ کھول دیا جاتا ہے۔

سرمایہ کی استحصالی قوت کا ایک اَور پہلو

سرمایہ کی استحصالی قوت کو اُجاگر کرنے میں ایک اَور پہلو نے بھی بڑا اہم کردار ادا کیا ہے۔ سرمایہ دارانہ نظامِ معیشت میں ''زر'' (Money) کے ذریعے مزید زر حاصل کرنے کا معاشی رویہ سامنے آیا ہے، جس نے سود کے جواز اور عدمِ جواز کی بحث کو سِرے سے ہی ختم کر کے رکھ دیا۔ اس سامراجی نظام کی انسانیت دشمن کہانی کا آغاز دراصل اسی بنیاد پر اور اسی معاشی رویے سے ہو جاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ تبادلۂ اشیا و اَجناس (Exchange of goods and commodities) معاشی تعاونِ باہمی کی اساسی ضرورت رہی ہے۔ انسان کے معاشی ارتقا نے تبادلے کے عمل کو سہل کرنے اور تعاونِ باہمی کو آسان تر بنانے کے لیے ''زر'' (Money) کی تخلیق کی ہے۔ سونے چاندی کے سِکّوں کی گردش (circulation) سے تبادلۂ اشیا کے عمل میں انتہائی آسانیاں پیدا ہو گئیں۔ لیکن وہی زر جسے تعاونِ باہمی کی اساس پر رواج دیا گیا تھا، سامراجی اور استحصالی ذہنیتوں نے اسے کرائے (Rent) پر چڑھانے کا ایسا تباہ کن سلسلہ شروع کیا کہ اس سے جدید شکل میں سرمائے کا سودی نظام فروغ پانے لگا۔ صنعتی دور میں اس سودی نظام نے یوں ترقی کی کہ عام لوگوں کی پس انداز کی ہوئی بچتوں (Savings) کو تعاونِ باہمی کے اصول پر صنعتوں

www.rahimia.org

(Industries) میں لگانے کے بجائے ''مزید زر'' حاصل کرنے کے لیے کرائے اور سود (Interest) پر چڑھانے کے نظریے کو فروغ دیا گیا۔ اس سے صنعت پر ایک مخصوص طبقے کی اجارہ داری (Monopoly) کا سلسلہ شروع ہوا۔ بینکوں میں اپنی بچتوں کو جمع کروانے والے افراد صنعتوں کے حقیقی فوائد ___ جو کہ اس کے سود سے کہیں زیادہ ہیں ___ سے محروم رہے۔ سرمایہ داروں کے لیے سرمایہ جمع کرنے والے بینکوں نے عام لوگوں کی جمع شدہ بچتوں کو ان سرمایہ داروں کی جھولی میں لا ڈالا۔ اس طرح صنعتوں کی ترقی کے حقیقی فوائد و ثمرات اپنی بچتوں کو بینکوں میں جمع کرانے والوں کے بجائے سرمایہ داروں نے خود سمیٹ لیے۔ یوں سرمایہ دار کی ایک فیکٹری کے بعد دوسری فیکٹری لگنے لگی۔ اس طرح بہ تدریج اجارہ داریاں (Monopolies) وجود میں آنے لگیں اور سرمایہ کا ایسا استحصالی پہلو سامنے آیا جو اس سے قبل موجود نہ تھا۔

''سرمایہ'' کی اصل حقیقت اور اس کا تعاونی کردار

اگرچہ سرمایہ داروں نے عملاً سرمائے کو استحصالی قوت دے رکھی ہے، ملکی صورتِ حال کا معاشی جائزہ اس پر گواہی دے رہا ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ بنیادی طور پر سرمایہ کسی استحصالی قوت کا نام نہیں ہے، بلکہ تعاونِ باہمی (Cooperation) کی اساس پر ایک ایسی قوت کا نام ہے، جو مثبت سرمایہ کاری میں اپنا کردار ادا کرتا ہے۔ یوں اس کا تعاونِ باہمی کا کردار زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔ اس لیے کہ عام لوگوں کے باہمی اجتماعی تعاون کے بغیر بچتوں پر مشتمل سرمایہ تشکیل پذیر ہی نہیں ہوسکتا۔ یہی وَجہ ہے کہ سرمائے کی تشکیل اور اُس کے داخلی وجود میں لوگوں کے اجتماعی تعاون کی کارفرمائی موجود ہے۔

یہ بات طے ہے کہ کسی چیز کی تشکیل اور اس کا وجود جس اجتماعی عمل اور اصولِ کلی کا مرہونِ منت ہو تو اس کے دائرۂ عمل میں اسی اجتماعی عمل اور اصول کی کارفرمائی ایک فطری امر ہے۔ اس لیے سرمایہ کا فطری اور صحیح استعمال یہ ہے کہ اسے تعاونِ باہمی کے اصول پر پورے انسانی معاشرے کی اجتماعی خدمت کے جذبے سے ہی استعمال میں لایا جائے۔ اس حوالے سے سرمائے کی فعالیت اور پیدائشِ دولت کے عامل ہونے کا کردار ایسا ہونا چاہیے، جو پورے سماج کی اجتماعی ترقی کا ذریعہ بنے۔

سرمایہ کے استحصالی کردار کا تجزیہ

ایک طرف تو سرمائے کی یہ حقیقت اور نوعیت ہے، جب کہ دوسری طرف سامراجی بیمار ذہنیت نے سرمائے کو باہمی تعاون میں استعمال کرنے کے بجائے استحصالی ہتھیار کے طور پر استعمال کرنے کے لیے اپنی ساری طاقت اور قوت صَرف کردی۔ اس سے عملاً یہ سمجھ لیا گیا کہ سرمایہ اور استحصال (Exploitation) آپس میں لازم و ملزوم ہیں۔ ایسا سمجھا جانا اگرچہ معروضی صورتِ حال میں بالکل صحیح تھا، لیکن سامراجی ذہنیت کے اس کردار نے سرمایہ کے بارے میں متضاد اور غیر حقیقت پسندانہ نظریوں کو جنم دیا۔

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک جانب سرمائے کو بنیادی عاملِ پیدائشِ دولت قرار دے کر اور انسانی محنت کی توہین کرکے اُسے استحصالی رُوپ دیا گیا تو اس کے ردِعمل میں دوسری جانب سرمایہ کے استحصالی کردار کے خاتمے کی جدوجہد میں اس کی تعاونی اہمیت کو نظرانداز کردیا گیا۔ یوں سرمایہ کی اصل حقیقت عام لوگوں کے ذہنوں میں کچھ اس طرح اُلجھا کر رکھ دی گئی کہ اس کا صحیح طور پر سراغ لگانا مشکل ہوکر رہ گیا۔ جب کہ ضرورت اس امر کی تھی اور ہے کہ سرمایہ کے استحصالی کردار اور اس کی ظالمانہ قوت کا خاتمہ

www.rahimia.org

کر کے اُس کی اجتماعی تعاون پر مشتمل قوت اور انسانی خدمت پر مبنی اس کے کردار کو سامنے لایا جائے۔ لوگوں کی چھوٹی چھوٹی بچتوں کے مجموعے سے مرتب ہونے والے اجتماعی نوعیت کے حامل سرمایہ(Capital) کو تعاونِ باہمی کے اصول پر اس طریقے سے استعمال میں لایا جائے کہ اس کے حقیقی فوائد سے اپنی اپنی بچتوں کو جمع کرنے والے تمام لوگ یکساں طور پر مستفید ہوں۔ اس طرح اس میں چھپی ہوئی تعاونِ باہمی کی قوت کا اظہار کچھ اس انداز میں سامنے آئے کہ پورا سماج اس سے فوائد حاصل کرے۔

محنت؛ حقیقی اور اصل عاملِ پیدائشِ دولت

ظاہر ہے کہ سرمایہ میں جو تعاونی قوت موجود ہے، وہ اپنے فطری اور اَساسی معاون یعنی محنت ایسے بنیادی عامل کے بغیر کوئی نتیجہ نہیں دے سکتی۔ انسانی محنت کے تعاون کے بغیر سرمائے کا اپنا وجود تک مشکوک ہو کر رہ جاتا ہے، چہ جائے کہ اس کا کوئی کردار سامنے آئے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ معاشی محنت کی اپنی ایک عظمت ہے۔ وہ ایک ایسا بنیادی عامل پیدائش دولت ہے کہ سرمایہ کے بغیر بھی پیدائش دولت کا عمل جاری رکھ سکتا ہے۔ ''زمین''(Land) پر مشتمل قدرتی اشیا کو ''دولت'' یا ''سرمایہ'' کی شکل دینا اور ان میں ''افادیت''(Utility) پیدا کرنا انسانی محنت کا ہی کام ہے۔ جدید دور میں ٹیکنالوجی کی تمام تر جدتیں بھی اس کی عظمت اور اہمیت کو چیلنج نہ کر سکیں۔ آج بھی ٹیکنالوجی کی تمام تر جدتوں اور تمام تر ترقی یافتہ آلات کے باوجود انسانی محنت کا اپنا ایک مقام ہے، جسے آئندہ بھی کسی صورت چھینا نہیں جا سکتا۔

اندریں حالات سرمایہ کی تعاونی قوت کا اُبھار اسی وقت ظاہر ہوگا، جب کہ اُسے انسانی محنت کا اساسی تعاون حاصل ہو۔ انسانی محنت کا تنوع اور اس کے اثرات وثمرات کا پھیلاؤ اسی وقت سامنے آئے گا، جب کہ سرمایہ کی تعاونی قوت اس کے ساتھ تعاون کرے۔ اس طرح انسانی محنت کو اصل اور بنیادی مقام دیتے ہوئے اُس کی عظمت اور بلندیٔ کردار کو تسلیم کرنا ہوگا۔ سرمائے اور محنت دونوں کے باہمی تعاون سے ایک ایسا توازن اور اعتدال پیدا کرنا ضروری ہے، جو یقینی طور پر انسانی سماج میں عدل و انصاف پر مبنی معتدل اور متوازن نظامِ معیشت قائم کرے۔ یوں ان دونوں میں تعاونِ باہمی کے اصول کی کارفرمائی سے درست معاشی نظام کی تشکیلِ جدید ممکن ہے۔

تعاونِ باہمی کا اُصول

تعاونِ باہمی کا اُصول انسانی زندگی کا ایسا لازمہ ہے کہ جو صرف معاشیات تک ہی محدود نہیں، بلکہ انسانی زندگی کے سیاسی، سماجی اور معاشرتی دائرے بھی اسی اصول کی بنیاد پر ترقی کرتے ہیں۔ البتہ معاشی نظام کی تشکیل میں اس کی اہمیت فطری طور پر دوچند ہو جاتی ہے۔ اس اصول کی وضاحت کرتے ہوئے امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ لکھتے ہیں:

> ''جب کہ انسان مدنی الطبع (یعنی فطری طور پر اجتماعیت پسند) واقع ہوئے ہیں تو ان کی معاشی زندگی باہمی تعاون واشتراک کے بغیر ناممکن ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے تعاون اور باہمی اشتراکِ عمل کو واجب کر دیا ہے۔ اور یہ بھی لازم کر دیا ہے کہ کسی فرد کو بھی (تعاونِ باہمی کے) ایسے امور سے کنارہ کش ہونے کا حق حاصل نہیں ہے، جو تمدن میں دخیل ہیں، مگر یہ کہ کسی شخص کو بعض مجبور کن حالات ایسا کرنے پر مجبور کریں۔''(2)

www.rahimia.org

تعاونِ باہمی ایسا بنیادی اور اساسی اصول ہے کہ معاشرے کے تمام سیاسی، سماجی، معاشی اور معاشرتی مسائل اس اصول کی روشنی میں حل کیے جاسکتے ہیں۔ چناں چہ کسی چیز کی مثبت یا منفی افادیت متعین کرنے کے لیے اس اصول کو سامنے رکھنا ہوگا۔ معاشیات کی بحث میں سرمایہ کی مثبت افادیت (Positive utility) اس وقت ظاہر ہوگی، جب کہ محنت کی اساسی حیثیت کے ذریعے اس کی تعاونی قوت کا اظہار ہو۔ اگر سرمائے کا استحصالی کردار (Exploitative characte) سامنے آتا ہے تو یہ اس کا منفی افادیت (Negative utility) کا پہلو ہوگا۔ اس حوالے سے سرمایہ کی تعاونی قوت پر مبنی مثبت سرمایہ کاری کی اہمیت اپنی جگہ مُسلَّم رہے گی۔ چناں چہ مالی ترقی اور سرمائے کے نمو کی ضرورت واضح کرتے ہوئے شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں:

''ثم الاستنماء فی أموال النّاس بمعونة فی المعاش یتعذّر أو یتعسّر استقامة حال المدینة بدونها.'' (3)

(پھر یہ بات بھی پیشِ نظر رہنا ضروری ہے کہ اگر معاشی معاملات میں لوگوں کے درمیان مالی تعاون اور اشتراکِ عمل کے ذریعے مالی ترقی اور نمو (بڑھوتری) بروئے کار نہ آئے تو ملک کی معاشی حالت کا درست رہنا بڑا ہی مشکل ہے۔)

عاملینِ پیدائشِ دولت؛ امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ کا نقطۂ نظر

حضرت الامام شاہ ولی اللہ دہلویؒ تعاونِ باہمی کے اس اصول کو بڑی وضاحت کے ساتھ بیان کرنے کے بعد پیدائشِ دولت کے اسباب پر گفتگو کرتے ہیں۔ چناں چہ شاہ صاحبؒ نے محنت اور سرمایہ کے مابین عادلانہ توازن کی بنیاد پر مثبت سرمایہ کاری اور اس کی بنیادی شرائط کا ذکر کیا ہے۔ وہ تحریر فرماتے ہیں:

''پیدائشِ دولت کا اصل الاصول یہ ہے کہ:

الف: حیازة الأموال المباحة: (اموالِ مباح (قدرتی مادی اشیا، جب کہ وہ کسی کے قبضے میں نہ ہوں) میں سے کسی شئے کو (اپنی محنت کے ذریعے) اپنے قبضے میں لیا جائے۔)

ب: استنماء ما اختصّ به، بما یستمدّ من الأموال المباحة: (انسان اموالِ مباح (اور اپنی محنت) کے ذریعے اپنے اس مال میں افزائش اور بڑھوتری پیدا کرے، جسے اس نے مزید نفع حاصل کرنے کے لیے مخصوص کرلیا ہے (یعنی سرمایہ)۔

مثلاً گھاس وغیرہ چرا کر اپنے ان جانوروں کی افزائش کرنا، جنھیں اس نے اس لیے پالا ہوا ہے، یا مقبوضہ زمین کی درستگی اور پانی کی سیرابی کے ذریعے سے زراعت اور کاشت کاری کرتا ہے۔

لیکن پیدائشِ دولت کی ان دونوں صورتوں میں اوّلین شرط یہ ہے کہ

''و یشترط فی ذٰلک أن لا یضیّق بعضهم علٰی بعض بحیث یفضی إلٰی فساد التّمدّن.''

(پیدائش کا عمل اس طرح نہ ہونے پائے کہ ایک فرد دوسرے فرد کے لیے معاشی تنگی کا باعث بن جائے اور اس طرح تمدن کو فاسد اور برباد کردے۔) (4)

www.rahimia.org

اس کے بعد حضرت شاہ صاحبؒ سرمایہ اور محنت کے مابین عادلانہ توازن پر مبنی اس سرمایہ کاری کی مختلف صورتیں بیان فرماتے ہیں، جو لوگوں کے درمیان تنگی پیدا کرنے کے بجائے تعاونِ باہمی کو فروغ دینے کا سبب بنتی ہیں۔ چناں چہ تجارتی سرمایہ اور انسانی محنت کے درمیان تعاون کی صورت بیان کرتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں:

ایک شخص وہ ہے، جو تجارتی سرمایہ کو ایک شہر سے دوسرے شہر لے جاتا ہے اور ایک معین مدت تک اس مال کی حفاظت کر کے محنت و مشقت برداشت کرتا ہے اور اس طریقے سے وہ اپنے تجارتی مال میں اضافہ کرتا ہے۔''(5)

صنعتی سرمایہ اور محنت کے مابین عادلانہ توازن پر مبنی تعاون کی وضاحت کرتے ہوئے شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں:

''ایک شخص لوگوں کے مال (جدید دور میں بچتوں پر مشتمل جمع شدہ سرمایہ) سے ایسی مصنوعات تیار کرتا ہے، یا ایسی ایجادات (جدید دور میں ٹیکنالوجی کی جدتیں بھی اس میں داخل ہوسکتی ہیں) کرتا ہے کہ جس سے اس مال میں بڑھوتری اور اضافہ ہوجاتا ہے۔''(6)

پیدائشِ دولت کی ان تمام صورتوں کو بیان کر کے شاہ صاحبؒ تعاونِ باہمی کے اصول کی اہمیت اُجاگر کرتے ہیں:

''ان سب صورتوں میں تعاون کے بغیر معاشی زندگی میں استواری پیدا نہیں ہوسکتی۔ بہرحال ان تمام معاملات میں صحیح تعاون اور اشتراکِ عمل ضروری اور واجب ہے۔ اگر سرمایہ کاری اس طریقے سے کی جائے کہ اس میں سِرے سے تعاون کا دخل ہی نہ ہو، جیسا کہ جوئے کا کاروبار کرنا، یا ایسے طریقے سے سرمایہ کاری کی جائے کہ بہ ظاہر تو تعاون نظر آتا ہو، لیکن حقیقت میں وہ زبردستی کا تعاون ہو، حقیقی تعاون نہ ہو، جیسا کہ سودی کاروبار میں ہوتا ہے۔''(7)

شاہ صاحبؒ کی نظر میں محنت کی عظمت

حضرت الامام شاہ ولی اللہ دہلویؒ محنت کی عظمت واضح کرتے ہیں۔ وہ سرمایہ کے مقابلے پر محنت کی سودا کاری کی قوت (Bargaining Power) کو کمزور بنانے اور اُسے کم اُجرت پر مجبور کردینے کو انتہائی غلط اور ظلم قرار دیتے ہیں۔ وہ محنت کش سے عدل کے متوازن اصولوں پر مبنی سودا کاری کو لازمی اور ضروری قرار دیتے ہیں۔ اس کی مجبوری کی رضامندی کو حقیقی رضامندی نہیں سمجھتے۔ مجبور محنت کش کی مجبوری سے فائدہ اٹھانے کو انسانی معاشرے میں باطل اور حرام قرار دیتے ہیں۔ چناں چہ شاہ صاحبؒ تحریر فرماتے ہیں:

''فإنّ المفلس یضطرّ إلٰی التزام ما لا یقدر علٰی إیفائہٖ، و لیس رضاؤہٗ رضاً فی الحقیقة، فلیس من العقود المرضیّة، و لا الأسباب الصّالحة، و إنّما ھو باطل و سحت بأصل الحکمة المدنیة.''

(ایک مفلس اور نادار اپنی معاشی پریشانیوں کی وَجہ سے ایسی ذمہ داریوں کا بوجھ اُٹھا لینے پر مجبور ہوجاتا ہے، جن کو پورا کرنے کی اپنے میں طاقت نہیں پاتا (یا ایسی کم اُجرت پر کام کرنے پر مجبور ہوجاتا ہے، جسے وہ اپنی ضروریات کے لیے ناکافی سمجھتا ہے۔) اس کی ایسی رضامندی حقیقت میں رضامندی نہیں ہے۔ یہ بات پسندیدہ معاہدات میں سے نہیں ہے اور نہ ہی یہ معیشت کے اصول کے صحیح اسباب میں ہے۔ یہ اصولِ تمدن کے مطابق سِرے سے باطل اور حرام معاملہ ہے۔''(8)

www.rahimia.org

حاصلِ کلام

اگرچہ امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ صنعتی دور سے قبل کی شخصیت ہیں، لیکن ان کے معاشی افکار کی روشنی میں سرمایہ اور محنت کے حوالے سے اصولی رہنمائی ملتی ہے۔ سرمایہ اور محنت کی بحث کو اگر شاہ صاحبؒ کے افکار کی روشنی میں دیکھا جائے تو بنیادی فکر یہ سامنے آتا ہے کہ معاشرے کی معاشی ترقی اسی میں مضمر ہے کہ سرمایہ اور محنت دونوں کے مابین عادلانہ توازن پر مبنی تعاونِ باہمی کو اس انداز سے فروغ دیا جائے کہ اس پر ملکی نظامِ معیشت کا ڈھانچہ اُستوار ہو سکے۔ اگر ان کے درمیان قائم شدہ توازن اور بیلنس ختم کر دیا جائے تو ملکی معاشی نظام میں تباہی کے اثرات بڑی دور تک جا پہنچیں گے۔ چناں چہ اگر سرمایہ کی طاقت اور قوت غلط طور پر استعمال ہو اور وہ محنت کو اصل عاملِ پیدائش سمجھنے کے بجائے اس پر حاوی ہو جائے اور اس سے عادلانہ توازن کے ساتھ معاملہ کرنے کے بجائے کمزور فریق کی حیثیت سے معاملہ کیا جائے تو معاشرے میں معاشی حوالے سے فساد اور ظلم پیدا ہو جائے گا۔ اسی طرح سرمائے کی مثبت صلاحیتوں سے انکار کرتے ہوئے محض محنت کی بنیاد پر آگے بڑھا جائے اور جدید ٹیکنالوجی اور صنعت پر مشتمل سرمائے کا تعاون حاصل نہ کیا جائے تو مطلوبہ نتائج کا حصول بہت معمولی حد تک ممکن تو ہے، لیکن یہ عمل انتہائی سست روی کا شکار ہو جائے گا، جس کے ملکی اور قومی ترقی پر منفی اثرات مرتب ہوں گے اور اجتماعی اور قومی مورال ختم ہو کر رہ جائے گا۔

اندریں حالات عادلانہ توازن پر مبنی تعاون کے اصول کو سامنے رکھتے ہوئے سرمایہ اور محنت کی قوتِ عاملیت کا لحاظ کرنا ضروری ہے۔ ان دونوں کے متوازن تعاون سے ہی مؤثر اور مفید نتائج سامنے آسکتے ہیں۔ ان کے درمیان عادلانہ توازن ہی مثبت نتائج کو یقینی بنا سکتا ہے اور فلاح و بہبود پر مبنی معاشی نظام کی تشکیل جدید میں بنیادی کردار ادا کرسکتا ہے۔

حوالہ جات

1۔ سین اینڈ داس، ابتدائی معاشیات، ص 330، نیز عوامل پیدائش دولت کی بحث بھی اسی کتاب کے متعلقہ صفحات پر دیکھی جاسکتی ہے۔

2۔ **حُجَّةُ اللّٰه البالغه**، از امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ، من ابواب ابتغاء الرّزق، ج:2، ص 74-273، طبع: مکتبہ حجاز، دیوبند۔

3۔ ایضاً۔

4۔ ایضاً۔

5۔ ایضاً۔

6۔ ایضاً۔

8۔ ایضاً۔

☆

www.rahimia.org

معاشیات

دین کے معاشی نظام میں محنت کی قدر و اہمیت

تحریر: مفتی عبدالخالق آزاد رائے پوری

معاشیات اور محنت کی قدر و اہمیت

یوں تو آج کے دور کا تقاضا یہ ہے کہ دین کے حوالے سے، انسانی زندگی کے تمام شعبوں میں محنت وعمل کی اہمیت کو اُجاگر کیا جائے۔ لیکن چوں کہ اس دنیا میں انسانی زندگی کے وجود کے لیے معیشت بنیادی حیثیت رکھتی ہے۔ اور ویسے بھی بقول حضرت مولانا قاری محمد طیب قاسمیؒ موجودہ دور اقتصادیات اور معاشیات کا دور ہے۔ اس لیے وقت کا تقاضا ہے کہ دین فطرت کے معاشی نظام میں ''محنت'' کی قدر و اہمیت پر روشنی ڈالی جائے۔ حضرت قاری محمد طیب قاسمیؒ فرماتے ہیں:

> ''آج کا دور سیاسی، معاشی اور مختلف نظریات کی سیاستوں اور معاشی فلسفوں کے غلبے کا دور ہے۔ مذہب بن رہے ہیں تو سیاسی۔ معاشی پارٹیاں بن رہی ہیں تو سیاسی۔ مسائل پیدا ہو رہے ہیں تو سیاسی اور معاشی۔ ان حالات میں جب تک کسی دینی مسئلے کو سیاسی چاشنی کے ساتھ پیش نہ کیا جائے، تو وہ عوام کے لیے قابلِ التفات نہیں ہوتا۔ اس لیے ضرورت ہے کہ ان مسائل کو حل کرنے کے لیے اسلام کو سیاسی اور معاشی رنگ کے دلائل سے پیش کیا جائے۔ یہ سیاسی رنگ اسلام کے حق میں کوئی بیرونی رنگ نہ ہوگا، بلکہ اسی کے اندر کا ہوگا۔ حالات محرک ہوں گے اور ان کے فطری اور طبعی قسم کے معاشی اور سیاسی پیکر، اس تحریک سے نمایاں ہو کر اسلام ہی کی سیاست و معیشت کو نمایاں کریں گے۔ اگر اس میں (اسلام میں) سیاست و اجتماعیت کے اصول و قوانین نہ ہوتے تو صدیوں تک اس کی وہ مثالی حکومتیں دنیا میں نہ چل سکتیں، جنھوں نے دین و دیانت کے غلبے کے ساتھ، سیاسی حکمرانی کے فرائض بھی سرانجام دیے اور آج بھی مسلم حکمرانوں کی بود و نابود اسی دور کی مستحکم فرماں روائیوں کے ثمرات ہیں۔''[1]

اس سے آج کے دور کے معروضی حقائق کا صحیح اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ کسی بھی دور سے متعلقہ مسائل کو جب تک حل نہ کیا جائے تو کوئی چیز بھی نافذ نہیں ہوسکتی۔ اس لیے وقت کا تقاضا ہے کہ ہمارے دین کے ذمہ دار حضرات دین کی معاشی حیثیت کو کماحقہ سمجھیں۔ یہ دور چوں کہ معاشیات کا دور ہے، اس لیے جب تک معروضی نقطۂ نگاہ سے معاشیات سے متعلقہ مباحث، اس کے علمی وعملی اثرات و نتائج، اس سے پیدا ہونے والے بگاڑ کا صحیح تجزیہ نہیں کیا جائے گا اور پھر دین کے موضوعی (طے شدہ) اصولوں کو آج کے معروضی حقائق کے ساتھ ملا کر صحیح حل پیش نہیں کیا جائے گا، اس وقت تک دنیا کے کروڑوں مسلمانوں کو سامراجی نظاموں سے نجات دلا کر دین اسلام کے عادلانہ نظام کا احیا ناممکن ہے۔

www.rahimia.org

''محنت'' معاشیات کی اصطلاح میں

انسانی حرکت و عمل ایک خاص مقصد سے ہو تو معاشیات میں اس کو ایک اصطلاح کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ چناں چہ معاشیات میں ہر انسان کی ہر حرکت و عمل کا نام ''محنت'' نہیں، بلکہ اس سے مراد

''ہر انسان کا ہر وہ ذہنی یا جسمانی فعل ہے، جس سے اشیائے صَرف میں ایک خاص قسم کی افادیت پیدا ہو جائے اور جس سے اس کا ارادہ اُجرت حاصل کرنا ہو۔''

یعنی معاشیات کی رو سے ''محنت کش'' ہر اُس انسان کو کہیں گے، جو کہ ''زمین'' (Land) سے پیدا ہونے والے قدرتی وسائل اور سرمائے میں محنت اور عمل کر کے اس کو انسانوں کے لیے مفید مطلب بنا دیتا ہے۔

محنت کی اس اصطلاحی تعریف سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان کی اجتماعی زندگی کے معاشی ڈھانچے (Structure) میں انسانی محنت، بنیادی اور جوہری کردار ادا کرتی ہے۔ اگر انسانی محنت نہ ہو تو پھر معاشیات کا سارا سٹرکچر زمین بوس ہو جائے۔ اس لیے کہ معاشیات کا ڈھانچا (Structure) انسانی محنت کے گارے سے چنا ہوا ہے۔ اور جب کسی معاشرے میں اس کی قدر و قیمت گر جائے تو وہ معاشرہ اپنا وجود کھو بیٹھتا ہے۔

معاشی محنت ..... اللہ تعالیٰ کی نظر میں

علم معاشیات کی نظر سے ''محنت'' کو دیکھنے کے بعد آیئے دیکھیں کہ دینِ فطرت نے ''محنت'' کو اپنے نظام میں کیا اہمیت دی ہے۔ چناں چہ ہم سب سے پہلے قرآن کریم میں دیکھتے ہیں، اس نے ''معاشی محنت'' کی اہمیت کو کس طرح بیان کیا ہے۔ چناں چہ اللہ تبارک و تعالیٰ لوگوں پر محنت کو واجب قرار دیتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں:

فَاِذَا قُضِيَتِ الصَّلٰوةُ فَانْتَشِرُوْا فِي الْاَرْضِ وَابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ [2]

(پس جب نماز تمام ہو جائے تو زمین میں پھیل جاؤ، اور اللہ تعالیٰ کے خزانوں سے رزق تلاش کرو۔)

اس آیت میں رزق کے لیے زمین میں پھیل جانے کا حکم دیا گیا۔ نیز تلاش اور سعی کا حکم ہے۔ دوسری جگہ اَمر کا صیغہ استعمال کیا ہے، جو کہ عام طور پر وجوب پر دلالت کرتا ہے۔ گویا رزق کے حصول کے لیے محنت اور سعی ضروری ہے۔ اس کے بغیر ''رزقِ حلال'' کا حصول مشکل ہے۔

ایک اور آیت میں اللہ تعالیٰ نے واضح طور پر ارشاد فرمایا کہ انسان کے لیے صرف وہی چیز ہے جو کہ اس نے اپنی سعی اور محنت سے کمائی۔ چناں چہ ارشادِ ربانی ہے:

وَاَنْ لَّيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى ﴿٣٩﴾ [3] (انسان کے لیے وہی ہے، جو اس نے محنت سے کمایا۔)

گویا انسانی سماج میں محنت ہی وہ اہم اور بنیادی چیز ہے کہ جس کی بدولت انسان اشیائے صرف کو اپنے زیرِ استعمال لاتا ہے۔

ایک اور آیت میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں کہ اس مال سے خرچ کرو جو تم نے اپنے ہاتھوں سے محنت کر کے کمایا ہے۔ چناں چہ ارشادِ ربانی ہے:

www.rahimia.org

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْفِقُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا كَسَبْتُمْ وَمِمَّآ اَخْرَجْنَا لَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ (4)

(اے ایمان والو! اس پاکیزہ مال سے خرچ کرو جو تم نے محنت کر کے پیدا کیا۔ اور اس مال سے جو ہم نے قدرتی طور پر زمین سے تمھارے لیے پیدا کیا۔)

اس آیت میں مسلمانوں کو حکم ہے کہ تم اپنی کمائی کا مال اللہ تعالیٰ کی راہ میں انسانی سماج کی خدمت کے لیے خرچ کرو۔ یہ انسان کی نفسیات میں سے ہے کہ جو چیز وہ محنت و مشقت سے حاصل کرے، اس کی محبت زیادہ ہوتی ہے۔ جو چیز بغیر محنت کے مفت مل جائے اس کی قدر و اہمیت نہیں ہوتی۔ اس لیے اس آیت میں انسان کی اسی بیماری کا علاج بتایا گیا ہے، کہ مال سے محبت کر کے اس کو جمع نہ کرے، بلکہ اپنی محنت کی کمائی کو اجتماعی مفاد کے لیے سوسائٹی پر خرچ کرے۔ اس طرح محنت کی اہمیت کے بیان کے ساتھ مال کو جمع کرنے والی خصلت کو بھی ختم کیا جا رہا ہے۔

سود کی حرمت کا اصل سبب ...... محنت کا نہ ہونا

دین کے معاشی نظام میں محنت کی اسی اہمیت کے پیشِ نظر، خدا تعالیٰ نے اس اُمت پر ''سود'' کو حرام قرار دیا۔ اس لیے کہ جس سوسائٹی میں سودی نظام رائج ہو جاتا ہے، وہ سوسائٹی عیش پسندی، اور آرام طلبی کی طرف مائل ہو جاتی ہے۔ جب بغیر کام کے محض سرمائے کے بل بوتے پر سودی ''منافع'' ملے تو بھلا کون آدمی ''محنت'' کرے گا؟ امام فخر الدین رازیؒ ''سود'' کی حرمت کی وجہ بیان کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

''إنّ اللّٰه تعالٰی إنّما حرّم الرِّبا من حیث أنّه یمنع النّاس عن الإشغال بالمکاسب، و ذٰلک لأنّ صاحب الدّرهم إذا تمکّن بواسطة عقد الرِّبا من تحصیل الدّرهم الزّائد، نقدًا کان أو نسیةً، و خفّ علیه اکتساب وجه المعیشة، فلا یکاد یتحمّل مشقّة الکسب، و التّجارة، و الصّناعات الشّاقة، و ذٰلک یفضی إلٰی انقطاع منافع الخلق، و من المعلوم أنّ مصالح العامّه لاتنتظم إلّا بالتّجارات، و الحِرَف، و الصّناعات، و العمارات.'' (5)

(اللہ تعالیٰ نے سود کو اسی وجہ سے حرام قرار دیا ہے کہ سودی کاروبار لوگوں کو محنت کے ذریعے مال کمانے سے روکتا ہے۔ اس لیے کہ جب سرمایہ دار، سودی کاروبار کے نتیجے میں ''قدرِ زائد'' نقد یا اُدھار کی شکل میں حاصل کرنے لگ جائے تو محنت کے ذریعے مال کمانے کی اہمیت، اس کے نزدیک کم ہو کر رہ جائے گی۔ پس وہ اتنی محنت و مشقت بھی برداشت نہیں کرے گا جو کہ اشیا کی تیاری اور اس کی خرید و فروخت میں ضروری ہوتی ہے۔ اس طرح یہ سلسلہ مخلوق کے تمام منافع کو ختم کر کے رکھ دے گا۔ حال آں کہ یہ بات طے شدہ ہے کہ دنیا جہان کی مصلحتیں تجارت، صنعت اور شہروں کی آبادکاری میں مضمر ہیں اور یہ چیزیں بغیر محنت کے وجود پذیر نہیں ہو سکتیں۔''

سود کی حرمت کی یہی وجہ حضرت امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے بھی بیان فرمائی ہے اور محنت کی اہمیت پر روشنی ڈالی ہے۔ چناں چہ ارشاد فرماتے ہیں:

www.rahimia.org

''و إذا جری الرّسم باستنماء المال بهٰذ الوجه أفضٰی إلٰی ترک الزّراعات و الصّناعات، الّتی هی اُصول الکاسب.'' (6)

(اور جب سودی کاروبار کے ذریعے مال بڑھانے کی رسم جاری ہوجائے تو لوگ کمانے کے بنیادی ذرائع، یعنی زراعت اور صنعت میں محنت کر کے مال کمانا ترک کر دیں گے۔)

قرآنی آیتِ ربا کی ان تشریحات سے معلوم ہوا کہ معاشرہ اور سماج کے لیے محنت کی بنیاد پر نظام کا قائم ہونا ضروری ہے۔ اگر کوئی فرد معاشرے میں محنت کے بغیر محض سرمائے کے بل بوتے پر سودی نظام قائم کرنے کی سعی کرتا ہے تو وہ حقیقت میں محنت کی اہمیت کا انکار کرتا ہے اور لوگوں کے اجتماعی فوائد کو ختم کر دینا چاہتا ہے۔ ایسا فرد معاشرے کی جڑوں کو کھوکھلا کر رہا ہے۔ اس کو محنت کا عادی بنانا از حد ضروری ہے۔

معاشی محنت اور حضور ﷺ کے ارشادات

قرآن کریم رہنمائی کے لیے ایک نظریہ اور نصب العین فراہم کرتا ہے۔ اور حضور اقدسؐ اس نظریے کے مطابق ایک عملی نظام اُمت کو دیتے ہیں، جسے قرآن نے ''اُسوۂ حسنہ'' سے تعبیر کیا ہے۔ جب قرآن نے ''محنت'' کو معاشی نظام میں اتنی اہمیت دی ہے تو پھر ناممکن ہے کہ حضرات انبیا علیہم السلام کی زندگی میں ہمیں اس کی جھلک واضح طور پر نظر نہ آئے۔ یہی وجہ ہے کہ تمام انبیا کرامؑ نے اپنی زندگی میں معاشی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے محنت اور مشقت برداشت کی ہے اور اس طرح خود اپنے ہاتھ سے حاصل کیے ہوئے ''پاکیزہ رزق'' کو اپنے تصرف میں لائے ہیں۔ انھوں نے اس میں کوئی عار بھی محسوس نہیں کی۔ جس طرح آج کل ایک مخصوص طبقہ موجودہ سرمایہ دارانہ نظام میں اپنا رویہ بنائے ہوئے ہے۔ چناں چہ آپؐ نے معاشی نظام میں ''محنت'' کی اہمیت کو اُجاگر کرتے ہوئے انبیاؑ کا طرزِ عمل بھی بتلا دیا ہے۔ ارشاد فرماتے ہیں:

''عن المقدام عنِ النّبیّ صلّی اللّٰہ علیه وسلّم قال: "ما أکل أحد طعاماً قطّ، خیرًا من أن یأکل من عمل یدہٖ، و أنّ نبیّ اللّٰہ داؤد علیه السّلام کان یأکل من عمل یدہ." '' (7)

(حضرت مقدام رضی اللہ کہتے ہیں کہ نبی اکرمؐ نے ارشاد فرمایا کہ: ''اپنے ہاتھ کی کمائی سے بہتر کوئی کھانا نہیں ہے۔ اور حضرت داؤد علیہ الصلوٰۃ والسلام جو اللہ کے نبی تھے، اپنے ہاتھ سے کما کر کھاتے تھے۔'')

ایک اور حدیث مبارکہ میں گزشتہ انبیاؑ کے وہ تمام پیشے بیان کیے گئے ہیں، جن میں یہ معزز ترین ہستیاں اپنے ہاتھ سے کام کر کے اپنی معاشی ضروریات پورا کیا کرتی تھیں:

''کان داؤد زرّاداً، و کان آدم حارثاً، و کان نوح نجّاراً، و کان إدریس خیّاطاً، و کان موسٰی راعیاً.'' (8) (حضرت داؤد علیہ السلام زرہ بناتے تھے۔ حضرت آدم علیہ السلام کاشت کاری کرتے تھے۔ حضرت نوح علیہ السلام بڑھئی تھے۔ حضرت ادریس علیہ السلام درزی تھے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام مویشی چراتے تھے۔)

آج کے دور اور حالات میں یہ حدیث انتہائی قابلِ غور ہے۔ ہمارا معاشرہ اس طرح کے کام کرنے والے محنت کش لوگوں کو

www.rahimia.org

ذلیل سمجھتا ہے اور انھیں ''کمی'' کہا جاتا ہے۔ یہ سارا اَثر اس جاگیر دارانہ، سرمایہ دارانہ نظام کے جبر کا ہے، جس میں ہم جکڑے ہوئے ہیں۔ ورنہ ایک حقیقی مسلمان ان تمام پیشوں کو سنت انبیا کرامؑ سمجھ کر کبھی ذلیل نہ سمجھتا۔

افسوس تو اس بات پر ہے کہ انگریز سامراج کو ہمارے ملک سے گئے ہوئے ایک عرصہ گزر چکا ہے، لیکن آج بھی ہمارے پٹوار خانے کے رجسٹروں میں یہ تمام پیشے ''کمی'' شمار کیے جاتے ہیں۔ اور پھر طرفہ تماشا یہ کہ دیہات کی مسجد کا امام بھی ان کمیوں میں شامل ہے۔ بلکہ اس کا اندراج رجسٹر میں کمیوں کے بھی نچلے درجے میں ہوتا ہے۔

گزشتہ انبیاؑ کے علاوہ خود آپؐ نے اپنی معاشی ضروریات اور احتیاجات کے لیے محنت و مشقت فرمائی اور اس سے اپنی ضروریات کو پورا فرمایا۔ چناں چہ امام بخاری نے آپؐ کا ارشادِ گرامی نقل کیا ہے:

''عن ابی هُريرة عن النّبیّ صلّی اللّٰه عليه و سلّم، قال: ''ما بعث اللّٰه نبيّاً إلَّا راعٰی الغنم، فقال أصحابه: و أنت؟ فقال: نعم! كنتُ أرعاها علٰی قراريط لأهل مكّة.'' [9]

(حضرت ابوہریرہ فرماتے ہیں کہ حضور اقدسؐ نے ارشاد فرمایا کہ: ''اللہ تعالیٰ نے کوئی نبی ایسا مبعوث نہیں کیا، جس نے بکریاں نہ چرائی ہوں۔'' صحابہ کرامؓ نے دریافت کیا: کیا آپ نے بھی بکریاں چرائی ہیں؟ آپ نے فرمایا: ''ہاں! میں نے بھی اہل مکہ کی بکریاں چند ٹکوں کے عوض چرائی ہیں۔'')

آج جس معاشرے کے افراد چرواہے کو حقیر نظروں سے دیکھتے ہیں اور محنت کش کی زندگی کا مذاق اُڑاتے ہیں، وہ اس حدیث کی روشنی میں اپنے طرزِ عمل کا اندازہ لگالیں۔ ایک اور حدیث مبارکہ میں آپؐ کے بارے میں وارد ہے:

''و أذرع رسول اللّٰه ﷺ بالجُرُف.'' [10]

(جرف مقام میں آپؐ نے خود کاشت کی۔)

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ آپؐ نے کسانوں کی طرح محنت کر کے خود کاشت کاری کی ہے۔ محنت کے ذریعے معاشی ضروریات کو پورا کرنے کی یہی اہمیت تھی کہ آپؐ نے اُمت کو ایک اور انداز سے بھی اس کی ترغیب دی ہے۔ فرماتے ہیں:

''عن ابی هُريرة رضی اللّٰه عنه، قال: قال رسول اللّٰه ﷺ: ''إنّ من الذّنوب ذنوبها لا تكفّرها الصّلٰوة، و لا الصّيام، و لا الحجّ و العمرة.'' قالوا: فما يكفّرها يارسول الله ﷺ؟ قال: الهَمّ فی طلب المعيشة.'' [11]

(حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہؐ نے ارشاد فرمایا کہ: ''یقیناً گناہوں میں سے بعض گناہ ایسے ہیں جن کی بخشش نہ نماز سے، نہ روزے سے، نہ حج سے اور نہ عمرے سے ہوتی ہے۔'' صحابہ کرامؓ نے عرض کیا کہ: اے اللہ کے رسول! پھر انھیں کون سا عمل بخشواتا ہے؟ آپؐ نے فرمایا: ''رزق کی تلاش میں غم اور فکر کرنا۔'')

اس حدیث میں جہاں معیشت کے لیے جدوجہد اور محنت کی ترغیب ہے، وہاں یہ حدیث ان لوگوں کے لیے تازیانہ عبرت بھی ہے۔ جنھوں نے دین کو صرف عبادات تک محدود کر رکھا ہے اور گناہوں کا کفارہ انھیں کو سمجھا جاتا ہے۔ حال آں کہ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ انسان کے بعض گناہ طرزِ معیشت کی محنت سے متعلق ہیں۔ اگر یہ محنت صحیح نہ ہوئی تو وہ گناہ جو دراصل

www.rahimia.org

سوسائٹی سے متعلق ہونے کی وجہ سے بڑے عظیم گناہ ہیں، اسی وقت معاف ہوسکتے ہیں، جب کہ ''طلبِ معیشت'' کے لیے صحیح نظام کی فکر انسان پر سوار ہو جائے، لیکن آج کے آرام پرست اور عیش پسندی کے دور میں ''محنت'' کو ایک عیب سمجھا جاتا ہے۔ یہ نتیجہ ہے اس سرمایہ پرستی کا جو سرمایہ دارانہ نظام کے تحت خوب برگ و بار لاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ موجودہ نظام میں ہر آدمی محض سرمایہ کا بندہ ہو کر رہ گیا ہے۔ محنت سے جی چرانا اس کا وطیرہ بن چکا ہے۔ پھر محنت کش لوگ خواہ وہ کسان ہو یا مزدور، ان کو انتہائی حقیر نظروں سے دیکھنے کی عادت بھی اس بے ڈھنگے معاشرے میں پیدا ہو چکی ہے۔ حال آں کہ آپ پڑھ چکے ہیں کہ تمام انبیائے کرامؑ ''محنت کش'' تھے۔ انھوں نے کوئی نہ کوئی پیشہ اختیار کر کے اپنی معاشی احتیاجات وضروریات کو پورا کیا۔ یہی نہیں بلکہ خود کما کر لوگوں میں تقسیم کیا، سوسائٹی کا خیال رکھا اور اسے ترقی دے کر بامِ عروج پر پہنچایا۔

معاشی محنت اور صحابہ کرامؓ کا عمل

اسی طرح حضرت انبیا کرامؑ کے بعد صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے بھی محنت اور مشقت کی زندگی اختیار کی۔ آرام طلبی اور عیش کوشی میں نہیں پڑے۔ چناں چہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا صحابہ کرامؓ کی زندگی کا نقشہ ان الفاظ کے ساتھ کھینچتی ہیں:

''قالت عائشةؓ: کان أصحاب رسول اللہ ﷺ: ''عُمّال أنفسهم فکان یکون لهم أرواح، فقیل الهمّ لو اغتسلتم.'' (12)

(حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ آپ ﷺ کے صحابہ کرامؓ محنت مشقت کا کام خود کیا کرتے تھے۔ جس کی وجہ سے پسینہ آ کر جسم میں بدبو پیدا ہو جاتی تھی۔ اسی لیے انھیں کہا گیا کہ اجتماع کے موقع پر (جمعہ کے دن) غسل کر کے آیا کرو!)

اسی طرح امام بخاری نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی ایک اور روایت حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے بارے میں نقل کی ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ خلیفۂ اول کس طرح اپنی معاشی ضروریات کے لیے محنت ومشقت کا کام کرتے تھے:

''أنّ عائشةَ قالت: لما استُخلِف ابوبکر ن الصّدّیق قال: ''لقد علم قومی إنّ حرفتی لم تکن تعجز عن مؤنة أهلی، و شغلت بأمر المسلمین، فسیأ کل آل ابی بکر من هٰذا المال و یحترف للمسلمین فیه.'' (13)

(حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ جب حضرت ابوبکر خلیفہ بنائے گئے تو انھوں نے خطبے میں ارشاد فرمایا: ''میری قوم یہ بات بہ خوبی جانتی ہے کہ میرا پیشہ میرے اہل وعیال کی کفالت بہ خوبی کر سکتا ہے۔ مگر اب میں مسلمانوں کے معاملاتِ (خلافت) میں مشغول کر دیا گیا ہوں۔ لہٰذا اب ابوبکر کے اہل وعیال کی قوت لایموت بیت المال سے ملے گی اور ابوبکر مسلمانوں کی خدمت کا پیشہ کرے گا۔''

اس روایت سے حضرت ابوبکر صدیق خلیفۂ اولؓ کا جو طرزِ عمل معلوم ہوتا ہے، وہ یہ ہے کہ معاشی ضروریات اور احتیاجات کے لیے محنت بنیادی عمل ہے۔ خواہ ہاتھ کے ساتھ عمل کر کے کوئی پیشہ اختیار کیا جائے، یا دماغی اور ذہنی محنت ومشقت کر کے وسائل رزق حاصل کیے جائیں۔

www.rahimia.org

محنت کش دین کی نظر میں

ان گزارشات سے یہ بہ خوبی واضح ہوگیا ہے کہ دین کے معاشی نظام میں ''محنت'' کو بہت بڑا مقام حاصل ہے۔ محنت کے بغیر معیشت کا پہیہ جام ہوکر رہ جاتا ہے۔ اب جو طاقت محنت و مشقت کرکے معیشت کے پہیے کو رواں دواں رکھتی ہے، اس کی اہمیت اس سے بھی دو چند ہوجاتی ہے۔ اور یوں محنت کش کا وجود معاشرے اور سوسائٹی کے لیے ضروری قرار پاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حضور اقدسؐ نے محنت کش کی اہمیت کو یوں اُجاگر فرمایا ہے:

''أعطوا الأجير أجره قبل أن يجفّ عرقُه.'' [14]

(مزدور اور محنت کش کی مزدوری اس کے پسینہ خشک ہونے سے پہلے ادا کردو!)

جو معاشرہ اور سوسائٹی محنت کش مزدور کسان کی مزدوری پوری نہ ادا کرے اور اس کی محنت کا استحصال کرے، اسے اس حدیث کے آئینے میں اپنی شکل ضرور دیکھنی چاہیے۔ ایک طرف تو مسلمانی کا دعویٰ اور پھر آپؐ کی محبت کا دعویٰ اور دوسری طرف آپ ﷺ کے ارشادِ گرامی کو پس پشت ڈال کر محنت کش کی محنت کا استحصال کیا جائے۔

ایک اور حدیث مبارکہ میں آپ ﷺ کا ارشاد ہے:

عن رافع بن خديج، قال: قيل يا رسول اللّٰه! أيّ الكسب أطيب؟ قال: ''عمل الرّجل بيدهٖ و كلّ بيع مبرور.'' [15]

(حضرت رافع بن خدیج فرماتے ہیں کہ رسول اللہؐ سے پوچھا گیا کہ اے اللہ کے رسول! کون سا پیشہ زیادہ پاکیزہ ہے؟ آپؐ نے فرمایا: ''ہاتھ کی مزدوری اور ہر سچی خرید و فروخت (جس میں جھوٹ فریب نہ ہو)۔'')

اسی طرح محنت کش کو اللہ کا دوست کہا گیا ہے:

''الكاسب حبيب اللّٰه.'' [16] (محنت کش اللہ تعالیٰ کا دوست ہے۔)

جو انسان اللہ تعالیٰ کا دوست ہو، ہم اسے دھتکاریں اور معاشرے میں اسے باعزت مقام نہ دیں، ایسا معاشرہ کسی طور پر بھی دینی یا اسلامی معاشرہ نہیں کہلا سکتا۔ ایسے معاشرے کو تبدیل کرنا از حد ضروری ہے، تاکہ صحیح اور عادلانہ سوسائٹی قائم کی جاسکے، جو خدا تعالیٰ کے ''حبیب'' کو ایک باعزت مقام دلا کر خدا کے غیظ و غضب سے اپنے آپ کو محفوظ رکھ سکے۔

خدا تعالیٰ تین طرح کے انسانوں کا دشمن ہے اور جس کی تفصیل بخاری شریف میں حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ایک روایت میں بیان کی گئی ہے: (حدیث قدسی ہے)

''قال اللّٰه تعالىٰ: ''ثلثة أنا خصمهم يوم القيامة: رجل أعطىٰ بی، ثم غدر. و رجل باع حرّا فأكل ثمنه. و رجل استأجر أجيراً فاستوفى منه و لم يعطه أجره.'' [17]

(اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ مَیں قیامت کے دن تین آدمیوں کا دشمن ہوں گا:

(ا) پہلا وہ آدمی جس نے میرے نام پر کسی سے عہد کیا اور پھر اسے توڑ دیا۔

www.rahimia.org

(۲) دوسرا وہ آدمی جو کسی آزاد آدمی کو فروخت کر کے رقم کھا گیا۔

(۳) تیسرا آدمی جس نے مزدور رکھا اور اس سے پورا کام کروایا، لیکن اسے اُجرت نہ دی۔)

اس حدیث کا تعلق جس طرح تین قسم کے افرادِ انسانی کے ساتھ ہے، اسی طرح ان تین ظالم اقوام سے بھی ہے، جو ایسا ہی کردار ادا کریں۔ چناں چہ اگر کوئی سامراجی قوم توسیع پسندی کے مہلک مرض میں مبتلا ہوکر آزاد قوموں کو غلام بنا کر فروخت کرنے کی عادی ہو اور اس رقم سے اپنی خوش حالی اور ترقی کا ڈھنڈورا پیٹے تو ایسی قوم کا دشمن خدا تعالیٰ اور وہ خدا تعالیٰ کی دشمن ہے۔

اسی طرح کوئی سامراجی نظام، کسی محنت کش قوم کی محنت کا استحصال کرے، اس کی محنت سے پیدا شدہ خام مال سستے داموں خرید لے اور پھر انتہائی مہنگے داموں اسی کو فروخت کر دے اور قرضوں کے جال میں جکڑ کر اس کی معیشت کو تباہ و برباد کر ڈالے، ایسی قوم بھی خدا کے عتاب کا نشانہ بنے بغیر نہیں رہ سکتی۔ ایسی خدا دشمن قوم کے خلاف جدوجہد کرنا اور ایسے نظام کو توڑنا جو محنت کا استحصال کرے، بالکل جائز اور خدا کی رَضا کا موجب ہے۔

حضورؐ کی تشکیل کردہ سوسائٹی میں محنت کی قدر و منزلت

محنت کے بغیر قائم شدہ معاشرہ چوں کہ انسانیت کے لیے ننگ و ذلت کا باعث ہے، اس لیے نبی کریمؐ نے ایسے معاشرے کے خلاف انقلاب برپا کر کے محنت کی بنیاد پر جو معاشرہ اور سماج تشکیل دیا تھا، اس کی کیفیت یہ تھی کہ جو انسان کوئی پیشہ اختیار کر کے محنت و مشقت نہیں کرتا تھا، صحابہ کرامؓ اور خلافت وحکومت کے نزدیک ایسے انسان کی کوئی حیثیت نہیں ہوتی تھی۔ خواہ اپنی ذات میں وہ کتنی ہی قدر و منزلت کیوں نہ رکھتا ہو۔ چناں چہ خلیفہ ثانی حضرت عمرؓ کے اس طرزِ عمل سے اس دور کے رویے کی پوری عکاسی ہوتی ہے:

''کان عمر رضی اللّٰہ عنه إذا نظر إلٰی ذی سیما، یسأل: أ لهٗ حرفة؟ فإذا قیل: لا، سقط من عینه.'' [18]

(حضرت عمرؓ عموماً جب کسی ذی وجاہت آدمی کو دیکھتے تو سوال کرتے: کیا یہ کوئی پیشہ اختیار کیے ہوئے ہے؟ جب کہا جاتا کہ: نہیں!، تو ایسا آدمی آپؓ کی نظروں سے گر جاتا۔)

جب خلیفہ وقت کی نگاہ سے کوئی آدمی گر جائے، بھلا اس کو باقی سوسائٹی کیسے عزت وشرف دے سکتی ہے۔

آج ہمارے ہاں معاملہ اُلٹ ہے۔ جو کوئی محنت نہ کرے محض سرمائے کے بل بوتے پر لوگوں کا استحصال کرے، وہ ہمارے معاشرے میں اہم مقام رکھتا ہے، لیکن جو بے چارہ اپنی عزت کو بچاتے ہوئے معاشرے میں محنت و مشقت کر کے اپنا اور اپنے بچوں کا پیٹ پالے، وہ ''کمی'' ہے۔ وہ حقیر مزدور اور کسان سمجھا جاتا ہے، جس کی معاشرے میں کوئی اہمیت اور قدر نہیں ہے۔

خدا کا خوف کھایئے! معاشرے کی کس قدر کایا پلٹ گئی کہ دین کے عروج کے دور میں جن کی قدر و منزلت تھی، وہ ذلیل سمجھے جائیں۔ جس فرد کی ثانوی حیثیت تھی، وہ معاشرے میں معزز ترین فرد سمجھا جائے۔ ایسے معاشرے کے خلاف اقدام کرنا اور اسے خلافتِ راشدہ کے منہاج پر لانا وقت کی اہم ترین ضرورت ہے۔

معاشی محنت ......فقہا اور علما کی نظر میں

قرآن کریم اُسوۂ نبی کریمؐ اور صحابہؓ کی زندگی کے نقشے سے ''محنت'' کا تصور جس طرح نکھر کر سامنے آتا ہے، اس کا نتیجہ ہے

www.rahimia.org

کہ ''محنت'' کا اثر ہمیں دین کے وارث سچے فقہائے امت اور علمائے حق کی زندگیوں میں بھی نظر آتا ہے۔ کتنے ہی فقہا و علما ہیں، جنھوں نے محنت کش کی زندگی گزاری ہے اور دین کی خدمت سرانجام دی ہے۔ ایسے محنت کش علما کی ایک طویل فہرست ہے، جنھوں نے ''محنت'' کی عظمت کو چار چاند لگائے اور اسی پیشے کی نسبت سے ان کا نام مشہور ہوگیا۔ اس پر کبھی انھوں نے عار محسوس نہیں کی۔ گنتی کے چند علما کا تذکرہ آپ کے سامنے پیش کیا جا رہا ہے۔

فقہ کے علم سے ذرا بھی مس رکھنے والا کون سا آدمی ایسا ہے جو امام ابوبکر احمد بن علی الرازی **الجصّاص** کے نام سے واقف نہ ہو۔ حضرت موصوف بڑے امامِ وقت تھے۔ آپ پیشے کے اعتبار سے ''**الجصّاص**'' یعنی ''چونا فروش'' کہلاتے تھے اور پھر امام خصاف کا حوالہ تو ہماری فقہ کی مشہور کتاب ''**ھدایہ**'' میں بار بار آتا ہے۔ امام احمد بن عمر، جن کی شہرت ''**الخصّاف**'' یعنی ''موچی'' کی حیثیت سے تھی۔ آپؒ جوتے سازی کا کام کرتے تھے۔ علم فقہ کی مشہور کتاب ''**مختصر القدوری**'' کے مصنف امام احمد بن محمد القدوریؒ کے نام سے تو مدارس اور سکول کے طلبا بہ خوبی واقف ہیں۔ آپؒ کی شہرت ''قدوری'' یعنی ''ہنڈیا فروش'' کے نام سے تھی۔ چند علما کے نام اور پیشے درجِ ذیل ہیں:

(1) احمد بن اَسماج ''**الصفار**'' یعنی پیتل کے برتن فروخت کرنے والا۔

(2) احمد بن علی الترمذی ''**الورّاق**'' کاغذ فروش۔

(3) ایوب بن ابی بکر ''**النّحاس**'' تانبے کا کام کرنے والے۔

(4) ابوعلی ''**الدّقّاق**'' آٹا پیس کر فروخت کرنے والے۔

(5) محمد بن محمد ابوطاہر ''**الدّباس**''، شیرہ بنانے والے اور شہد اور شیرہ فروخت کرنے والے۔

(6) محمد بن ابی القاسم المعروف ''**بالبقالی**'' بقّال، سبزی فروش۔

(7) محمد بن عبداللہ **الصّائغ** یعنی سنار، زرگر۔

(8) محمد بن ابی بکر المعروف بخمیر ''**الوبری**'' اُون کا کاروبار کرنے والے۔

(9) احمد بن محمود ''**الحصیری**'' چٹائی بنا کر فروخت کرنے والے۔

(10) احمد بن محمود نور الدین ''**الصّابونی**'' صابن بنا کر فروخت کرنے والے۔

(11) محمد بن احمد المعروف ''**بالزّعفرانی**'' زعفران فروش۔

(12) شمس الائمہ ''**الحلوائی**'' حلوا فروش۔[19]

یہ صرف چند علما کی فہرست ہے، جنھوں نے اپنی زندگی میں معاشی ''محنت'' میں کوئی عار محسوس نہ کی۔ ورنہ ایسے محنت کش حضرات علما و فقہا کی ایک طویل فہرست ہے، جو انساب کی کتابوں میں دیکھی جاسکتی ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں، جنھوں نے اپنی معاشی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے کوئی نہ کوئی ''پیشہ'' ضرور اختیار کیا اور تو اور فقہ کے امام، امامِ اعظم ابوحنیفہ جو سب اماموں کے امام ہیں، وہ بھی ''بزّاز'' یعنی ''کپڑا فروش'' تھے۔ آپؒ کا کپڑے کا وسیع کاروبار تھا۔

www.rahimia.org

معاشی محنت عقل کی نظر میں

گزشتہ سطور میں دین کی روشنی میں معاشی محنت کی اہمیت واضح ہوگئی ہے۔ عقلی طور پر بھی دیکھا جائے تو واضح ہوگا کہ محنت کے بغیر انسان بے کار محض ہوجاتا ہے۔ اس لیے رزق کے حصول کے لیے جدوجہد کرنا از بس ضروری ہے۔ ورنہ محنت کے بغیر زندگی گزارنے والا انسان معاشرے پر بہت بڑا بوجھ ہے، جس کو ہر فرد نفرت کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے علما نے ہمیشہ ''محنت'' کو انسان کا لازمہ قرار دیا۔ اور جس نے محنت ترک کی، اس کو ملامت کی۔ چناں چہ علامہ راغب اصفہانی اپنی مشہور کتاب ''الذّریعه إلٰی مکارم الشّریعه'' میں ''محنت'' کی اہمیت کو یوں ذہن نشین کراتے ہیں:

''**و لمّا جعل اللّٰه تعالٰی للحیوان قوّة التّحرک لم یجعل له رزقاً إلاَّ بسعيٍ مّا منه، و لئلاَّ تتعطّل فائدة ما جعل بقوّة التّحرُّک.**'' [20]

(اور جب اللہ تعالیٰ نے انسان کو حرکتِ عمل کی قوت عطا فرمائی تو رزق کے حصول کے لیے سعی و محنت بھی ضروری قرار دی، تاکہ قوتِ عملیہ کا فائدہ بے کار اور ضائع نہ چلا جائے۔)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے انسان پر یہ واجب ہے کہ وہ رزق کے حصول کے لیے محنت کرے اور اگر انسان واقعی انسانیت کے درجے پر رہنا چاہتا ہے تو ''محنت'' میں سستی اور کوتاہی نہ کرے۔ چناں چہ موصوف نے ایک مستقل باب ''**في مدح السّعي و ذمّ الکسل**'' (محنت کی مدح اور بے عملی کی مذمت) کے عنوان سے قائم فرمایا ہے۔ اس میں لکھتے ہیں:

''**من تعطّل و تبطّل انسلخ من الإنسانیة، بل من الحیوانیة، و صار من جنس الموتٰی.**'' [21]

(جس نے محنت چھوڑی اور بے کار رہنے لگا، وہ انسانیت کے مرتبے سے نکل گیا، بلکہ حیوانیت کے درجے سے بھی گر گیا اور مُردوں کی فہرست میں داخل ہوگیا۔)

اس سے معلوم ہوا کہ حقیقی طور پر انسان صرف اور صرف وہی ہے جو معاشرے میں رہ کر ''محنت'' کرکے سوسائٹی کو فائدہ پہنچائے اور جو آدمی محنت کے بغیر سرمایہ پرستی کی لعنت میں مبتلا رہے اور سرمائے پر سود کو منافع کے نام سے اُڑا کر یہ سمجھتا ہے کہ وہ بھی انسان ہے اور وہ انتہائی غلطی پر ہے، وہ انسان نہیں، حیوان ہے، بلکہ بے حس مردہ ہے۔

لہٰذا وقت کی پکار یہی ہے۔ ایسے سرمایہ پرست مُردوں کی سڑانڈ سے معاشرے کو پاک کیا جائے۔ اس لیے کہ مردہ جب سڑتا ہے تو بدبو پیدا کرتا ہے، جس سے انسانوں کے دماغ پھٹنے کے قریب ہوجاتے ہیں۔ آج وہی نقشہ ہے کہ معاشرے کے یہ ناسور (جو مُردے ہیں) معاشرے میں سڑانڈ پیدا کررہے ہیں، انھیں جلد اُٹھا کر دفن کردیا جائے، تاکہ انسانیت اَمن و سکون کا سانس لے سکے۔

خلاصۂ کلام

گزشتہ تمام گزارشات میں یہ بات بہ خوبی واضح ہوگئی کہ دین کے معاشی نظام میں اصل اور بنیادی حیثیت محنت اور ''فقط محنت'' کو حاصل ہے۔ انبیا کرامؑ، صحابہ کرامؓ، فقہا عظامؒ اور اولیا کرامؒ کے اقوال اور ان کے طرزِ عمل سے یہ حقیقت مزید نکھر کر سامنے آجاتی ہے۔ لہٰذا آج کے دور میں یہ انتہائی ضروری ہے کہ ان حضرات کے اُسوۂ حسنہ کو سامنے رکھتے ہوئے معاشی محنت اور محنت کش کی عظمت

www.rahimia.org

کو معاشرے میں اُجاگر کیا جائے۔ اس کو وہی مقام دیا جائے جو خیرالقرون میں اسے حاصل تھا۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ ''محنت'' کی بنیاد پر دین کا پورا معاشی نظام تشکیل دیا جائے۔ اس لیے مکمل نظم کے بغیر کوئی اُصول اپنی قدر و قیمت نہیں منوا سکتا۔

محنت کی بنیاد پر نظام کا خاکہ

محنت کی بنیاد پر نظام تشکیل دینے کے لیے بنیادی خاکہ، امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے بیان کردہ اقتصادی اُصولوں میں ہمیں ملتا ہے۔ درجِ ذیل اقتصادی اُصول حضرت مولانا سیّد محمد میاںؒ نے حضرت شاہ صاحبؒ کی کتابوں سے اَخذ کر کے ترتیب دیے ہیں:

اقتصادی اُصول:

(1) دولت کی اصل بنیاد محنت ہے۔ اور مزدور اور کاشت کار قوتِ کاسبہ ہیں۔ باہمی تعاون مدنیت ''شہریت'' کی روحِ رواں ہے۔ جب تک کوئی شخص ملک اور قوم کے لیے کام نہ کرے، ملک کی دولت میں اس کا کوئی حصہ نہیں۔

(2) جوا، سٹہ اور عیاشی کے اڈے ختم کیے جائیں، جن کی موجودگی میں تقسیم دولت کا صحیح نظام قائم نہیں ہوسکتا۔ اور بجائے اس کے قوم اور ملک کی دولت میں اضافہ ہو۔ دولت بہت سی جیبوں سے نکل کر ایک سمت آتی ہے۔

(3) مزدور، کاشت کار اور جو لوگ ملک اور قوم کے لیے دماغی کام کریں، دولت کے اصل مستحق ہیں۔ ان کی ترقی اور خوش حالی ملک اور قوم کی ترقی اور خوش حالی ہے، جو نظام ان قوتوں کو دبائے، وہ ملک کے لیے خطرہ ہے۔ اس کو ختم ہونا چاہیے۔

(4) جو سماج محنت کی صحیح قیمت ادا نہ کرے، مزدوروں اور کاشت کاروں پر بھاری ٹیکس لگائے، قوم کا دشمن ہے۔ اس کو ختم ہوجانا چاہیے۔

(5) ضرورت مند مزدور کی رَضامندی قابل اعتبار نہیں، جب تک اس کی محنت کی وہ قیمت ادا نہ کی جائے جو امدادِ باہمی کے اُصول پر لازم ہوتی ہے۔

(6) جو پیداوار اور آمدنی تعاونِ باہمی کے اُصول پر نہ ہو، وہ خلافِ قانون ہے۔

(7) کام کے اوقات محدود کیے جائیں۔ مزدوروں کو اتنا وقت ضرور ملنا چاہیے کہ وہ اپنی اَخلاقی اور روحانی اصلاح کر سکیں۔ اور ان کے اندر مستقبل کے متعلق غور و فکر کی صلاحیت پیدا ہو سکے۔

(8) تعاونِ باہمی کا بہت بڑا ذریعہ تجارت ہے۔ لہٰذا اس کو تعاون کے اُصول پر ہی جاری رہنا چاہیے۔ پس جس طرح تاجروں کے لیے جائز نہیں کہ وہ بلیک مارکیٹ یا غلط کمپی ٹیشن سے روحِ تعاون کو نقصان پہنچائیں، ایسے ہی حکومت کے لیے درست نہیں کہ بھاری ٹیکس لگا کر تجارت کے فروغ اور ترقی میں رُکاوٹ پیدا کرے یا رَخنہ ڈالے۔

(9) وہ کاروبار جو دولت کی گردش کو کسی خاص طبقے میں منحصر کردے، ملک کے لیے تباہ کن ہے۔

(10) وہ شاہانہ نظامِ زندگی، جس میں چند اشخاص یا چند خاندانوں کے عیش و عشرت کے سبب سے دولت کی صحیح تقسیم میں خلل واقع ہو، اس کا مستحق ہے کہ اس کو جلد از جلد ختم کر کے عوام کی مصیبت ختم کی جائے۔ اور ان کو مساویانہ نظامِ زندگی کا موقع دیا جائے۔ (تِلْكَ عَشَرَةٌ كَامِلَةٌ)

www.rahimia.org

یہ وہ رہنما اقتصادی اساسی اُصول ہیں کہ جن پر اگر صحیح طریقے سے عمل کر کے نظام کی تشکیل کی جائے تو ایک ایسا معاشرہ قائم ہوسکتا ہے، جس میں ہر انسان کی بنیادی ضروریات پوری ہوں۔ اس کی محنت کا استحصال ہونے کے بجائے اس کا پورا پورا حق ادا ہوسکے۔ محنت کش کی محنت کی پوری قیمت اس کے پسینہ خشک ہونے سے قبل ادا ہوجائے۔ محنت کش کو معاشرے میں باعزت مقام مل جائے۔ اور اس طرح ایک ایسی سوسائٹی قائم ہوجائے، جس میں تمام لوگ امن وسکون کی زندگی بسر کرسکیں، اور اپنی دنیاوی زندگی سے مطمئن اور آسودہ حال ہونے کے بعد زیادہ سے زیادہ اَخلاق اور روحانی ترقی میں منہمک ہوجائیں۔

لیکن ایسے نظام کے قیام سے قبل موجودہ سرمایہ دارانہ سامراجی استحصالی نظام کا خاتمہ اَزحد ضروری ہے۔ اس لیے کہ یہ وہ نظام ہے، جس میں محنت کش کا انتہائی بے دردی سے استحصال کیا جاتا ہے۔ سارا سارا دن محنت کرنے کے بعد اسے اتنی روزی نہیں ملتی کہ وہ اپنا اور اپنے بچوں کا پیٹ باعزت طریقے سے پال سکے۔ اس نظام پر جیسے دن گزرتے جاتے ہیں غریب غریب سے غریب تر اور امیر امیر سے امیرتر ہوتا جاتا ہے۔ یہ طبقاتی نظام، جس میں اَسی نوے فیصد افراد کے استحصال پر مبنی معاشرے میں دس بیس فیصدی افراد عیاشی کرتے ہیں۔ اور محنت کش کو مزید پیس کر رکھ دیتے ہیں، اس قابل نہیں کہ اس کو برقرار رکھا جائے۔ اس کا خاتمہ کروڑوں انسانوں کے امن وسکون کی ضمانت فراہم کرتا ہے۔

حوالہ جات

1۔ کلماتِ طیبات فکر اسلامی کی تشکیل جدید، ص 51، مطبوعہ مکتبہ رحمانیہ، اردو بازار، لاہور۔ 2۔ القرآن 10:62۔

3۔ القرآن 39:53۔ 4۔ القرآن 2:267۔ 5۔ تفسیر الکبیر الامام الرازی، ص 87، ج 7، طبع دار الکتب العلمیہ، طہران

6۔ حُجّة اللّٰه البالغه، امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ، من أبواب ابتغاء الرّزق، باب البیوع النھی عنھا، ص: 281، ج: 2، طبع: مکتبہ حجاز، دیوبند

7۔ صحیح بخاری، کتاب البیوع، باب کسب الرجل و عمله بیده، حدیث نمبر 2072۔ فتح الباری، کتاب البیوع، ج 1، ص 278۔

8۔ فتح الباری شرح صحیح بخاری، للإمام ابن حجر الشّافعیؒ، ج: 4، ص 306۔

9۔ صحیح بخاری، کتاب الإجارات، باب رعی الغنم علٰی قراریط، حدیث 2262۔

10۔ المبسوط للسّرخسی، ج: 2، ص: 22۔ 11۔ مجمع الزوائد، للإمام بیھقیؒ، کتاب الکسب و التّجارة، ج: 4۔

12۔ صحیح بخاری، کتاب البیوع، باب کسب الرّجل و عمله بیده، حدیث 2071۔

13۔ ایضاً، حدیث 2070۔ 14۔ رواہ ابن ماجه، مشکوة، ج 1، ص 258، مطبوعہ مجتبائی، دہلی۔

15۔ مسند احمد الرّسالة 502/28۔ 16۔ حاشیة الشهاب علٰی تفسیر البیضاوی.

17۔ صحیح البخاری، کتاب الإجارة، باب إثم من منع أجر الأجیر، حدیث 2270۔

18۔ الذریعه الی مکارم الشریعة، علام راغب اصفہانی، الباب الخامس وجوب التکسب، ص: 200، مطبوعہ مصر۔

19۔ تفصیلات کے لیے الفوائد البهیه اور کتاب الانساب لسمعانی کا مطالعہ کریں۔

20۔ الذّریعه إلٰی مکارم الشّریعه، ص: 201۔ 21۔ ایضاً۔

☆

www.rahimia.org

محنت؛ حقیقی اور اصل عاملِ پیدائشِ دولت

سرمایہ میں جو تعاونی قوت موجود ہے، وہ اپنے فطری اور اَساسی معاون یعنی محنت ایسے بنیادی عامل کے بغیر کوئی نتیجہ نہیں دے سکتی۔ انسانی محنت کے تعاون کے بغیر سرمائے کا اپنا وجود تک مشکوک ہو کر رہ جاتا ہے، چہ جائے کہ اس کا کوئی کردار سامنے آئے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ معاشی محنت کی اپنی ایک عظمت ہے۔ وہ ایک ایسا بنیادی عامل پیدائش دولت ہے کہ سرمایہ کے بغیر بھی پیدائش دولت کا عمل جاری رکھ سکتا ہے۔''زمین''(Land) پر مشتمل قدرتی اشیا کو''دولت'' یا''سرمایہ'' کی شکل دینا اور ان میں''افادیت'' (Utility) پیدا کرنا انسانی محنت کا ہی کام ہے۔ جدید دور میں ٹیکنالوجی کی تمام تر جدتیں بھی اس کی عظمت اور اہمیت کو چیلنج نہ کر سکیں۔ آج بھی ٹیکنالوجی کی تمام تر جدتوں اور تمام تر ترقی یافتہ آلات کے باوجود انسانی محنت کا اپنا ایک مقام ہے، جسے آئندہ بھی کسی صورت چھینا نہیں جا سکتا۔

اندریں حالات سرمایہ کی تعاونی قوت کا اُبھار اسی وقت ظاہر ہوگا، جب کہ اُسے انسانی محنت کا اساسی تعاون حاصل ہو۔ انسانی محنت کا تنوع اور اس کے اثرات وثمرات کا پھیلاؤ اسی وقت سامنے آئے گا، جب کہ سرمایہ کی تعاونی قوت اس کے ساتھ تعاون کرے۔ اس طرح انسانی محنت کو اصل اور بنیادی مقام دیتے ہوئے اُس کی عظمت اور بلندیٔ کردار کو تسلیم کرنا ہوگا۔ سرمائے اور محنت دونوں کے باہمی تعاون سے ایک ایسا توازن اور اعتدال پیدا کرنا ضروری ہے، جو یقینی طور پر انسانی سماج میں عدل و انصاف پر مبنی معتدل اور متوازن نظامِ معیشت قائم کرے۔ یوں ان دونوں میں تعاونِ باہمی کے اصول کی کارفرمائی سے درست معاشی نظام کی تشکیلِ جدید ممکن ہے۔

(سرمایہ اور محنت میں عادلانہ توازن، ص:105)

www.rahimia.org

QUARTERLY
Shauor o Aaghi

April-June,2019 Vol.11 Issue,2 Regd.370-S

www.rahimia.org

رحیمیہ مطبوعات

رحیمیہ ہاؤس، 33/A کوئینز روڈ (شارع فاطمہ جناح) لاہور
00-92-42-36307714, 36369089 www.rahimia.org
info@rahimia.org /rahimiainstitute

www.rahimia.org